زلزلہ

ازقلم

قائد اہلسنّت، مناظر اسلام
حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ

تقدیم

مولانا محمد یوسف رضا قادری

شائع کردہ

مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن بھیونڈی
۱۳۶ سلیمان بلڈنگ، امام احمد رضا روڈ، کوٹر گیٹ، بھیونڈی

جگ جگ آرٹ، امام احمد رضا روڈ، سلیمان بلڈنگ، کوٹر گیٹ، بھیونڈی - 9822088370 / 7774078600

زلزلہ

اس کتاب میں دیوبندی لٹریچر کے حوالوں سے یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ جن امور کو علمائے دیوبند انبیا و اولیا کے حق میں شرک قرار دیتے ہیں انہی امور کو وہ اپنے گھر کے بزرگوں کے حق میں عینِ ایمان و اسلام سمجھتے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے ان کی توحید پرستی کا سارا بھرم کھل جائے گا۔

(ارشد القادری)

نام کتاب : زلزلہ

تالیف : علامہ ارشدالقادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

پروف ریڈنگ: حضرت مولانا عبدالمبین نعمانی صاحب قبلہ

تقدیم : مولانا محمد یوسف رضا قادری bexindia@yahoo.com

صفحات : ۲۴۰

ایڈیشن : نواں (نہم)

سن اشاعت: ربیع الآخر ۱۴۳۶ھ، جنوری ۲۰۱۵ء

تعداد : ایک ہزار (۱۰۰۰)

قیمت : ۱۵۰ر روپے

کمپوزنگ : سرفراز احمد عبدالغنی مومن (بھیونڈی)

تزئین وطباعت: کلک آرٹ اینڈ پرنٹس

۱۳۶ر سلیمان بلڈنگ، امام احمد رضا روڈ، کوٹر گیٹ، بھیونڈی۔

موبائل:09822088370 ای میل:clickart92@gmail.com

باہتمام : ایم۔یو۔ایف (M.U.F) بھیونڈی، مہاراشٹر، انڈیا

www.mufindia.net

فہرست

5

★★-----------★★★-----------★★★

تقدیم

از: مولانا محمد یوسف رضا قادری

(بانی مسلم یونیٹی فاؤنڈیشن، رکن جامعہ حضرت نظام الدین اولیانئی دہلی)

غالباً ۱۹۹۵ء کی بات ہے دہلی میں قائد اہلسنّت رئیس التحریر حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ جامعہ حضرت نظام الدین اولیا کی پر شکوہ عمارت میں قائد اہلسنّت سے ایک تفصیلی ملاقات ہوئی اور مختلف امور پر تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ اسی دوران میں نے حضرت علامہ سے دریافت کیا کہ حضور کے دل میں زلزلہ نامی کتاب کے لکھنے کا خیال کیسے آیا؟ اور اس میں جو مواد بیان کیا گیا ہے اس کی فراہمی کیسے ہوئی؟ تو علامہ صاحب نے وجہ تالیف بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"بہت عرصہ پہلے کی بات ہے 'تذکرۃ الرشید' نامی کتاب میرے ہاتھ لگی اِدھر اُدھر سے دیکھا اور پھر تفصیلی مطالعہ کے لیے اُسے اپنے پاس رکھ لیا، پھر جب موقع ملا اور میں نے اسے بالاستیعاب پڑھنا شروع کیا تو حیرت واستعجاب کے سمندر میں ڈوب گیا اس لیے کہ اُس میں مولوی رشید احمد گنگوہی کے کشف وغیب دانی، کرامات وتصرفات کے ایسے ہی واقعات بیان کیے گئے تھے جیسے عموماً ہمارے یہاں اولیاے کاملین کے بیان کیے جاتے ہیں۔ جسے علماے دیوبند کفر وشرک قرار دیتے ہیں اور اسی بنیاد پر ہمیں مشرک، بدعتی اور قبوری شریعت کا حامل کہتے نہیں تھکتے۔ ان واقعات کے مطالعے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ان واقعات کے ذریعے

میں علماے دیوبند کی توحید پرستی کا سارا بھرم توڑ سکتا ہوں، ساتھ ہی میں نے اس حقیقت کا بھی اندازہ لگالیا کہ ہو نہ ہو دوسرے دیوبندی بزرگوں کی سوانح عمری میں بھی اس نوعیت کا مواد موجود ہوگا۔ چنانچہ میں نے دیوبندیوں کے دوسرے بزرگوں کی حیات وخدمات پر لکھی جانے والی کتابوں کی تلاش شروع کردی اور میری توقع کے عین مطابق اُن کا ہر بزرگ صاحبِ کشف، غیب داں اور عظیم کرامات وخدائی تصرفات کا حامل نکلا، کوئی غوثِ اعظم ہے تو کوئی قطبِ ربانی گویا یہ مولویوں کی جماعت نہ ہو بلکہ اولیا کی۔

ایک زمانے تک اس قسم کی کتابوں کا مطالعہ کرنے اور مواد جمع کر لینے کے بعد میں نے فیصلہ کرلیا کہ اب میں ایک ایسی کتاب لکھوں گا جس سے ایوانِ دیوبندیت میں زلزلہ آجائے گا اور علماے دیوبند کی حقیقی تصویر دنیا کے سامنے آجائے گی۔ انبیا اور اولیا کی وہ صفات جسے یہ لوگ شرک وبدعت قرار دیتے ہیں وہی صفات خود ان کے گھر کے بزرگوں میں ماننا ان کے لیے معمول کی بات ہے۔"

یہ ہے زلزلہ کی وجہِ تصنیف جسے خود علامہ نے مجھ سے بیان کیا۔ میں یہ دعویٰ تو نہیں کرتا کہ میں نے علامہ ہی کے لفظوں میں اسے بیان کردیا ہے مگر مفہوم صدفی صد یہی تھا۔ علامہ سے یہ سوال کرنے کی وجہ یہ تھی کہ زلزلہ نامی کتاب پڑھ کر خود میرے دماغ میں یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ آخر اس کتاب کے لکھنے کا خیال علامہ کے دل میں کیسے آیا اور دیوبندیوں کی کتابوں میں کشف وکرامات کے ایسے واقعات موجود ہیں اس پر علامہ پہلی مرتبہ کب آگاہ ہوئے اور مواد کی فراہمی کیسے ہوئی؟

بے شک زلزلہ نامی کتاب لکھ کر علامہ نے اُمتِ مسلمہ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ ۱۸۵۷ کے بعد پیدا ہونے والا دیوبندی فرقہ بڑے طنطنے کے ساتھ یہ دعویٰ کرتا تھا کہ دنیا بھر کے مسلمان شرک میں مبتلا ہیں اور بزرگوں کو خدائی درجہ دے دیا گیا ہے۔ نجدیوں کی طرح

ہندوستان میں اگر کوئی شرک و بدعات سے مبرّا اور توحید کا سچا علمبردار ہے تو وہ علماے دیوبند ہیں۔ مگر یہ اُن کی بدقسمتی ہے کہ وہ جن عقائد کی بنیاد پر مسلمانوں کی غالب اکثریت کو مشرک و بدعتی قرار دیتے رہے ہیں اور انبیا اور اولیا کے حق میں ایک لمحے کے لیے بھی قبول کرنے کو تیار نہ تھے خود گھر کے بزرگوں کے لیے انھوں نے ایک ایک عقیدہ تسلیم کرلیا ہے۔ اس طرح سے انھوں نے اس بات کا ثبوت دے دیا کہ انبیا اور اولیا کے لیے ان کا دل کتنا تنگ ہے۔ اگر مسلمانوں کے عقائد واقعی شرک تھے تو اُسے اپنے بزرگوں کے بارے میں کیوں تسلیم کرلیا گیا اور اگر اپنے بزرگوں کے بارے میں اُن عقائد کو تسلیم کرنا عینِ توحید ہے تو انبیا اور اولیا کے حق میں اُسے کیوں شرک قرار دیا جارہا ہے؟

کتاب کا موضوع کیا ہے یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے اس لیے کہ مصنف علیہ الرحمہ نے اسے خود انتہائی موثر انداز میں بیان کردیا ہے۔ میں صرف اس کتاب کی چند خصوصیات کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہوں گا۔

اس کتاب نے دیوبندی فرقے کا ایسا تعارف کروادیا ہے کہ اب ان کے بارے میں کسی کو کوئی غلط فہمی نہیں ہوگی۔ مصنف علیہ الرحمہ نے ایک مقام پر فرمایا کہ ''دیوبندی مسلک تضادات کا مجموعہ ہے۔'' اور پھر ایسے ناقابل تردید شواہد سے اسے ثابت کردیا کہ اب وادیٔ نجد کے علما بھی زلزلہ نامی کتاب سے استفادہ کرنے والوں میں نظر آرہے ہیں اور اس کتاب نے ان کی معلومات میں بھی گراں قدر اضافہ کردیا ہے اور 'دیوبندی مذہب تضادات کا مجموعہ ہے' اس حقیقت کو انھوں نے بھی تسلیم کرلیا ہے۔

سعودی عرب کے مشہور مفتی حمود بن عبداللہ بن حمود التویجری نے ۳۵۰ صفحات پر مشتمل ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے ''القول البلیغ فی التحذیر من جماعۃ التبلیغ'' (تبلیغی جماعت سے ڈرانے کے لیے قولِ بلیغ) علماے دیوبند اور تبلیغی جماعت کے رَد میں علماے نجد کی جانب سے لکھی جانے والی غالباً یہ سب سے مبسوط کتاب ہے مگر یہ سُن کر آپ کو حیرت ہوگی کہ اس کتاب کا ستر فی صد حصّہ زلزلہ ہی سے ماخوذ ہے۔

دراصل جب دیوبندیوں اور غیر مقلدوں میں دوریاں پیدا ہوگئیں تو غیر مقلدوں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ اب ہمیں دیوبندی مسلک کے بارے میں وہ حقائق جو زلزلہ نامی کتاب میں شرح وبسط کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں علماے نجد کے سامنے پیش کرنا چاہیے تاکہ سعودی عرب سے دیوبندیوں کو کاٹا جاسکے، جس کا براہ راست فائدہ ہمیں ہوگا اس لیے کہ اس وقت سعودیہ کی زکوٰۃ، فطرہ، صدقات وعطیات کی رقم دو جھولیوں میں بٹ جاتی ہے اگر دیوبندیوں کا وہ تعارف جو زلزلہ نامی کتاب میں پیش کیا گیا ہے، نجد کے شیوخ کے سامنے پیش کردیا جائے تو اس مقصد میں کامیابی مل سکتی ہے، چنانچہ اسی مقصد کے تحت برصغیر کے غیر مقلد مولویوں نے زلزلہ کے مواد کو عربی میں منتقل کر کے نجدی شیوخ کی خدمت میں پیش کردیا اور انھیں یہ بتادیا کہ جس طرح سے ہمارے نزدیک بریلوی شرک وکفر میں مبتلا ہیں بالکل اسی طرح دیوبندی علما بھی شرک وکفر میں مبتلا ہیں مگر آپ کے سامنے آکر وہ موحد بن جاتے ہیں اور اپنی جھولیاں بھر کرلے جاتے ہیں۔ بس پھر کیا تھا شیخ تویجری نے ''القول البلیغ'' لکھ کر دیوبندیوں پر بھی وہی چارج لگادیا جو وہ دنیا بھر کے اہلِ سنّت پر لگاتے ہیں۔

اس کتاب میں کچھ ایسی باتیں بھی بیان کی گئی ہیں جس سے ہمارے کان بھی آشنا نہیں تھے مثلاً تبلیغی جماعت کے امیر انعام الحسن کا ایک عجیب وغریب واقعہ شیخ تویجری نے یوں بیان کیا ہے:

''فقد جاءني جميل الياس ابن الشيخ منير الدين ومعه شير محمد الأميني الهنديان، وذكر لي جميل الياس قصة ملخصها: أن الشيخ انعام الحسن أمير جماعة التبليغ قد شكّ أنه مسحور، وقد عالجه أحد تلاميذ جميل من البنجاليين، وكان الشيخ انعام لا يعرف أنه تلميذ جميل الياس، وبدأت قصة العلاج هكذا:

قال البنجالي لانعام الحسن: اخلع جميع ما عليك من اللباس وابقَ كما خرجت من بطن أمك!

وكان في غرفة، وحوله ستارة مربعة، وفي أركان الغرفة أزيار فخارية فيها ماء، فدس في كل زِير مادة لونها أحمر عند تحريكها تصبغ، وفي كل زِير شجرة مَوْز۔

فقال البنجالي للشيخ انعام: سأقرأ ثم أنفخ عليک، وعندما تحس بنفخي، اقطع أشجار الموز واحدة بعد الأخرى۔

وبعد القرائة والنفخ رُفعت الستارة، وعمل ما طلب منه البنجالي من قطع الأشجار، وظن الشيخ أن الماء احمرّ من خروج السحر من جسده الى الأزيار، وظن أنه قد برأ من السحر، وأخبر أصحابه وأحبابه وأصدقاءه ففرحوا بذلک وهنؤوه۔

وبعده قال البنجالي للشيخ: ان السحر يمكن أن يعود اليک في أي وقت، وأريد أن أصدّه عنک الى الأبد بتعاويذ تكون معک دائماً لا تفارقک۔"

(القول البليغ في التحذير من جماعة التبليغ)

(تالیف: حمود بن عبداللہ بن حمود التویجری، ریاض سعودی عرب، ص ۳۹)

ترجمہ: میرے پاس دو ہندوستانی، جمیل الیاس ابن شیخ منیر الدین اور شیر محمد امینی آئے۔ جمیل الیاس نے مجھ سے قصہ بیان کیا، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ تبلیغی جماعت کے امیر انعام الحسن کو شک ہوا کہ مجھ پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔ اور اس نے جمیل کے شاگردوں میں سے کسی بنگالی (جادوگر) سے علاج کروایا۔ شیخ انعام الحسن، جمیل کے شاگرد کو نہیں جانتے تھے اور علاج کا قصہ اس طرح بیان کیا کہ بنگالی جادوگر نے انعام الحسن سے کہا 'اپنے جسم کا پورا کپڑا اُتار دو اور اس طرح سے برہنہ ہو جاؤ جس طرح سے تم اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے وقت تھے۔'

وہ بنگالی ایک کمرے میں تھا اور اس کے گرد پردے تھے اور کمرے کے ستونوں میں مٹی کے مٹکے تھے، ان میں پانی تھا اس میں سے ایک مٹکے میں سرخ رنگ کا مادہ تھا اور ہر ایک مٹکے میں ایک کیلے کا پودا رکھا۔ پھر بنگالی نے انعام الحسن سے کہا کہ میں پڑھوں گا اور تم پر دم کروں گا، جب تم میرے دم کو محسوس کرو تو کیلے کا پودا ایک کے بعد ایک کاٹ دینا۔ پڑھنے اور دم کرنے کے بعد پردہ اٹھ گیا۔ اور انعام الحسن نے ویسا ہی کیا جیسا کہ بنگالی نے انہیں حکم دیا تھا، یعنی درختوں کو کاٹنے کا، اور انعام الحسن نے گمان کیا کہ پانی سرخ ہو گیا ہے، ان کے جسم سے جادو کے نکلنے کی وجہ سے اور یہ بھی گمان کیا کہ جادو کے نکلنے سے وہ صحتیاب ہو گئے، اور اپنی صحت یابی کی اپنے احباب اور دوستوں کو خوشخبری سنائی تو وہ اس پر خوش ہوئے اور انھوں نے ان کی صحت یابی پر ان کو مبارکباد دی۔ لیکن علاج کے بعد بنگالی نے انعام الحسن سے کہا کہ پھر کبھی کسی وقت جادو تم پر لوٹ سکتا ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ایک تعویذ کے ذریعہ اس کی روک تھام کروں۔ یہ تعویذ تم ہمیشہ اپنے پاس رکھنا اور کبھی جدا نہ کرنا۔"

اسی قسم کا ایک واقعہ شیخ تویجری نے مولوی عمر پالن پوری کے بارے میں بھی بیان کیا ہے کہ انھیں بھی یہ شک ہو گیا تھا کہ میرے اوپر کسی نے جادو کر دیا ہے جب اس کا ذکر انھوں نے انعام الحسن سے کیا تو انعام الحسن نے اُسی بنگالی کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا اور پھر عمر پالن پوری نے بھی بنگالی جادوگر سے اپنا علاج کروایا۔ مگر بنگالی نے انعام الحسن کی طرح عمر پالن پوری کو بھی اپنے سامنے برہنہ کیا یا نہیں اس کی تفصیل شیخ تویجری نے بیان نہیں کی۔

زلزلہ نامی کتاب کے مواد نے بعض غیر مقلد مولویوں کو بھی اپنے قبیلے میں ہیرو بننے کا موقع فراہم کیا۔ پاکستان کے غیر مقلد مولوی طالب الرحمٰن نے "دیوبندیت" نامی ایک کتاب لکھی ہے جس کی اشاعت مکتبہ بیت السلام ریاض سعودی عرب سے ہوئی ہے۔ اس میں بھی سارا مواد زلزلہ ہی سے لیا گیا ہے گو اصل کتابوں کا حوالہ بھی دے دیا گیا ہے۔ اس کتاب میں

متعدد مقامات پر زلزلہ کے مصنف کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے، ایک جگہ زلزلہ سے ایوانِ دیوبندیت میں جو تباہی و بربادی آئی اس کا تذکرہ کرتے ہوئے طالب الرحمٰن لکھتے ہیں:

"جب بریلویوں کے ارشد القادری نے 'زلزلہ' نامی کتاب لکھ کر دیوبندیوں کو ناکوں چنے چبوائے، ان کا ناطقہ بند اور جینا حرام کر دیا، نیندیں اُڑا دیں اور سکون چھین لیا تو اُنھیں اپنے اصلی چہرے کے ساتھ سامنے آنا پڑا اور 'زلزلہ در زلزلہ' نامی کتاب لکھ کر اُدھار چکانے کی ناکام کوشش کی۔"

(دیوبندیت، ص: ۱۱۱، مکتبہ بیت السلام، ریاض)

اسی طرح سے صفحہ ۳۱/ ۲/ ۳۲/ ۳۳/ ۸۲ پر بھی طالب الرحمٰن نے زلزلہ کے حوالے پیش کیے ہیں۔

قائد اہل سنّت کی کتاب زلزلہ نے جہاں علماے دیوبند کے بھیانک چہرے سے نقاب اُلٹ کر اصل چہرہ امت کے سامنے پیش کیا وہیں اہل سنّت کی حقانیت بھی ظاہر کر دی نیز کون کس کا عقیدت کیش اور وفادار ہے یہ بھی ظاہر کر دیا۔ اس کتاب کے مطالعہ کے دوران آپ واضح طور پر محسوس کریں گے کہ زلزلہ کا مصنف ایک انتہائی مخلص اور وفادار وکیل کی حیثیت سے انبیا اور خاصانِ خدا کی عظمتوں کا دفاع کر رہا ہے اور وہ اپنے نبی کا ایسا وفادار اور عاشق زار ہے کہ بار بار وہ اپنے دامن کو علماے دیوبند کے سامنے پھیلا کر اپنے نبی کی عظمت کی بھیک مانگتا ہے اور کہتا ہے 'جو وصف، جو خوبی، جو کمال تم نے اپنے مولویوں کے لیے مان لیا ہے میرے نبی کے لیے بھی مان لو، میرے آقا کے لیے بھی مان لو ہمارا اور تمہارا اختلاف ختم ہو جائے گا'۔

علماے دیوبند سے اپنے آقا کی عظمتوں کو منوانے کے لیے انتہائی کرب کے عالم میں اس عاشق زار نے اپنے دامن کو پھیلا کر جو بھیک مانگی ہے وہ پُرسوز مناظر آپ کو کتاب میں جا بجا نظر آئیں گے۔

مگر علماے دیوبند ایسے سنگ دل اور ظالم ہیں کہ اُن کے دل پر اُس عاشقِ زار کی پُرسوز پکار کا کوئی اثر نہ ہوا اور آج تک وہ انبیا اور اولیا کے لیے اُن اوصاف و کمالات کے قائل نہیں ہوئے ہاں اپنے گھر کے بزرگوں کے لیے وہ اُن اوصاف و کمالات کے ضرور قائل ہیں۔

زلزلہ کے جواب میں لکھی جانے والی کتابیں "زلزلہ در زلزلہ، انکشاف، بریلوی فتنے کا نیا روپ" وغیرہ میں بزرگانِ دیوبند کے لیے تو اُن اوصاف و کمالات کا دفاع کیا گیا ہے اور اس کے ثبوت میں دلائل بھی دیے گئے ہیں مگر انبیا اور اولیا کی عظمتوں کو فتووں کی زد پر ہی رہنے دیا گیا۔

کلمہ پڑھ کے بھی نبی کی عظمت کے اعتراف کے لیے دل کی تنگی کی جو شکایت دورِ نبوی میں ایک گروہ سے تھی آج اس کا یقین ہمیں علماے دیوبند کو دیکھ کر ہی ہوتا ہے۔ اگر علماے دیوبند کے دل میں نبیِ اکرم ﷺ کی ذرا بھی عقیدت و محبت ہوتی اور شریعت کا پاس و لحاظ ہوتا تو وہ فتووں کی ان کتابوں کو دریا بُرد کر کے واقعات کی کتابوں کو باقی رکھتے یا واقعات کی کتابوں کو دریا بُرد کر کے فتووں کی کتابوں کو باقی رکھتے۔ جیسا کہ انھیں کے قبیلے کے ایک مولوی عامر عثمانی نے مشورہ دیا تھا۔ مگر علماے دیوبند جیسا ہوشیار آپ کو دنیا میں کہیں نہ ملے گا، واقعات کی کتابیں بھی باقی ہیں اور فتووں کی کتابیں بھی۔ غیب داں اور خدائی تصرفات ثابت کرنے والے واقعات بزرگانِ دیوبند کے لیے اور انھیں صفات کو شرک ثابت کرنے کے لیے فتوے انبیا، اولیا اور رحمت عالم ﷺ کے لیے۔

ایسا کیوں ہوا؟

اگر علماے دیوبند سے غلطی یا بھول چوک ہوئی ہوتی تو وہ زلزلہ نامی کتاب کے منظر عام پر آنے کے بعد اپنی اصلاح کر لیتے۔ مگر یہ سب کچھ انھوں نے منصوبے کے تحت کیا ہے۔ تبلیغی جماعت کے ایک بڑے بزرگ مولوی زکریا کاندھلوی کے ایک ملفوظ نے مجھے سکتے میں ڈال دیا۔ صحبتے با اولیاءؒ کے نام سے مولوی تقی الدین ندوی نے مولوی زکریا کاندھلوی کے ملفوظات کو جمع کیا ہے مولوی زکریا فرماتے ہیں:

"ہمارے اکابر حضرت گنگوہیؒ و حضرت نانوتویؒ نے جو دین قائم کیا تھا، اس کو مضبوطی سے تھام لو، اب قاسمؒ و رشیدؒ پیدا ہونے سے رہے، بس ان کی اتباع میں لگ جاؤ۔"

(صحبتے با اولیاء، ص:۱۵۵، کتب خانہ یحیوی محلہ مفتی سہارنپور یوپی)

اس سنسنی خیز انکشاف سے معلوم ہوا کہ دیوبندیوں کا دین وہ دین نہیں ہے جسے محمد الرسول اللہ نے قائم کیا بلکہ دیوبندیوں کا دین وہ ہے جسے مولوی رشید گنگوہی اور مولوی قاسم نانوتوی نے قائم کیا ہے اور اسے قبول کرنے کی صورت میں اتباع بھی انھیں کی واجب ہے۔ پھر یہ صرف مولوی زکریا کاندھلوی کا قیاس و خیال نہیں ہے بلکہ منصب نبوت کی طرف پیش قدمی کرنے والا خود بھی اپنے منہ سے یہ دعویٰ کر چکا ہے۔ مولوی رشید گنگوہی کا یہ دعویٰ تذکرۃ الرشید میں یوں مذکور ہے:

''سن لو حق وہی ہے جو رشید احمد کی زبان سے نکلتا ہے اور بقسم کہتا ہوں کہ میں کچھ نہیں ہوں مگر اس زمانہ میں ہدایت و نجات موقوف ہے میرے اتباع پر۔''

(تذکرۃ الرشید، جلد:۲، ص:۱۷، مکتبہ الشیخ، محلہ مفتی سہارنپور یوپی)

معاذ اللہ! سن لیا آپ نے!! کیا سنایا آپ کو گنگوہی صاحب نے؟ اگر ہدایت و نجات چاہیے تو ان کی اتباع کرنی ہوگی محمد عربی ﷺ کی اتباع اس زمانے میں کافی نہیں ہے۔ میں اس ایمان سوز دعوے پر بہت طویل تبصرہ کر سکتا ہوں مگر اختصار کے ساتھ آپ کو یہ بتانا چاہوں گا کہ نئے دین کا نیا بانی اور نیا مطاع۔

اس دین کو بحر و بر میں پھیلانے کے لیے جو جماعت تگ و دو کر رہی ہے وہ ہے تبلیغی جماعت۔ اب تبلیغی جماعت کے بانی مولوی الیاس کاندھلوی کا ایک اور انکشاف ملاحظہ فرمائیے۔ فرماتے ہیں:

''ایک بار فرمایا: مولانا تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) نے بہت بڑا کام کیا ہے، بس میرا دل یہ چاہتا ہے کہ تعلیم تو ان کی ہو اور طریقۂ تبلیغ میرا ہو کہ اس طرح ان کی تعلیم عام ہو جائے گی۔''

(ملفوظات مولانا الیاس، ص:۵۸، ملفوظ:۵۶)

(مرتب: مولانا منظور نعمانی، کتب خانہ اعزازیہ، دیوبند)

طریقۂ تبلیغ بھی نیا، تعلیمات کا مجموعہ بھی نیا، مطاع بھی نیا، دین بھی نیا۔ اب آپ کو

بات سمجھ میں آ گئی ہوگی کی جس طرح آپ کے یہاں انبیا اور اولیا کی ایک جماعت ہے اُسی طرح دیوبندی مسلک کے اپنے انبیا اور اولیا کی ایک جماعت ہے کشف و غیب دانی، کرامات و تصرفات کے واقعات جس طرح اُمّت اپنے نبی اور اولیا کی بیان کرتی ہے اُسی طرح دیوبندی بھی اپنے نئے دین کے جھوٹے انبیا اور اولیا کے کرامات و معجزات بیان کرتے ہیں۔

زلزلہ نامی کتاب کے ذریعے اگر محمد عربی ﷺ کی اُمّت یہ سمجھتی ہے کہ اب دیوبندی بھی انبیا اور اولیا کے لیے اُن اوصاف و کمالات کو تسلیم کر لیں گے جنھیں وہ مانتے ہیں تو یہ ممکن نہیں ہے اس لیے کہ دیوبندیوں کے یہاں اُن کے اپنے نبی اور ولی ہیں وہ انھیں کے لیے ان اوصاف و کمالات کو تسلیم کریں گے، بلکہ کلمہ و درود بھی پڑھیں گے، جیسا کہ رسالہ ''الامداد'' (ماہ صفر ۱۳۳۶ھ) کے شمارے میں مولوی اشرف علی تھانوی کے ایک مرید نے خواب میں اور بیداری میں یوں کلمہ و درود پڑھا:

''لا الٰہ الا اللہ اشرف علی رسول اللہ''

''اللھم صل علی سیدنا و نبینا و مولانا اشرف علی''

(رسالہ: الامداد، ماہ صفر ۱۳۳۶ھ)

معاذ اللہ! یہ بحث میں نے اس لیے چھیڑی ہے کہ آپ کو سمجھ میں آ جائے کہ ایک صفت نبی کے لیے ماننا شرک اور وہی صفت اپنے مولوی کے لیے ماننا عین توحید، تو وجہ یہ ہے کہ جو جس کا عقیدت مند ہے اس کی عظمتوں کے قصیدے پڑھ رہا ہے۔ اس لیے علمائے دیوبند کو قائل کرنا انتہائی مشکل امر ہے۔

آخر میں عرض کرنا چاہوں گا کہ زلزلہ ایک ایسی کتاب ہے جس کے ذریعے ہم آنے والی نسلوں کو یہ بتا سکیں گے کہ کون کس کا معتقد ہے اور کون کس کی عظمت ثابت کرنے میں لگا ہے۔ بہت زمانے سے یہ اہم کتاب اسی پرانے طرز پر چھپ رہی تھی اس کی اہمیت کے پیش نظر مسلم یونیٹی فاؤنڈیشن نے اسے کمپوزنگ کر کے جدید طرز پر شائع کرایا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس سے مصنّف علیہ الرحمہ کی روح خوش ہوگی۔ ساتھ ہی میں بقیۃ السلف حضرت علامہ مولانا

عبدالمبین نعمانی صاحب قبلہ کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جنھوں نے اس کی تصحیح فرمائی اور یہ مقدمہ بھی انھیں کے حکم پر میں نے رقم کیا ہے۔ حالاں کہ وہ خود مجھ سے اچھا لکھ سکتے تھے مگر انھوں نے مجھے حکم دیا جس کی میں نے تعمیل کی۔

دنیا بھر کے اہل سنّت سے میں گزارش کروں گا کہ وہ خاص طور پر زلزلہ اور قائد اہل سنّت علیہ الرحمہ کی دیگر کتابوں کو زیادہ سے زیادہ عام کریں۔ موجودہ دور کے فرقوں کا چہرہ بے نقاب کرنے کے لیے قائد اہل سنّت کی کتابیں انتہائی موثر ثابت ہوں گی، اس لیے کہ آپ کا طرز تحریر انتہائی دل نشین، مہذب، معقول، سائنٹیفک ہوتا ہے اور زبان وادب کا ذوق رکھنے والے بھی ان کی کتابوں کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

پانچ لاکھ روپئے انعام

اس کتاب کو شائع کیے ہوئے ۴۳ سالوں کا عرصہ گزر گیا مگر آج تک کوئی اس کا ایک حوالہ بھی غلط ثابت نہ کر سکا۔ مصنف علیہ الرحمہ نے اپنے دور میں ایک حوالہ غلط ثابت کرنے پر دس ہزار روپے کا انعام رکھا تھا آج ہم مسلم یونیٹی فاؤنڈیشن کی جانب سے اعلان کرتے ہیں کہ اب بھی اگر کوئی اس کا ایک حوالہ بھی غلط ثابت کر دے تو اسے پانچ لاکھ روپے انعام دیا جائے گا۔

فقیر محمد یوسف رضا قادری

۲۳ ربیع الاول ۱۴۳۶ھ

15 جنوری 2015ء

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ



سب سے پہلے میں قادر وکریم کی بارگاہ میں خراجِ تشکر پیش کرتا ہوں کہ اس نے 'زلزلہ' کے ذریعے لاکھوں سرگشتگانِ وادیٔ ضلالت کو حق وہدایت کی منزل کی طرف پلٹنے کی توفیق مرحمت فرمائی اور صرف اپنے فضل وکرم سے قلم کی ایک حقیر خدمت کو عالمی شہرت واعزاز بخشا۔

قارئین کرام اس واقعہ سے بے خبر نہ ہوں گے کہ ذہن وفکر میں زلزلہ ڈالنے والی اس تاریخی کتاب کے جواب میں دیوبندی جماعت کی طرف سے کئی کتابیں شائع کی گئیں، جس کے جواب الجواب پر مشتمل ''زیروزبر'' کے نام سے ایک ضخیم کتاب میں نے تصنیف کی۔ جو چھپ کر ساری دنیا میں پھیل گئی۔

بخیہ اُدھیڑنے کا محاورہ غالباً آپ نے سنا ہوگا، اگر اس محاورے کو محسوس شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں تو 'زیروزبر' کا مطالعہ فرمایئے۔ کتاب کیا ہے دیوبند کے مسند نشینوں کے سروں پر قہر الٰہی کی ایک لٹکتی ہوئی تلوار ہے۔ پانچ سال سے یہ کتاب ان کی غیرت کو چیلنج کر رہی ہے، لیکن ہر طرف موت کا سناٹا طاری ہے۔ اب دیوبندی عوام ہی اگر چاہیں تو ان کے علما کا مہرِ سکوت ٹوٹ سکتا ہے۔

زلزلہ کی ضرورت، اہمیت اور مقبولیت کے پیشِ نظر اب فوٹو آفسیٹ کی طباعت اور پلاسٹک کی خوبصورت جلد کے ساتھ ہم اسے اس شان سے پہلی بار عوام کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ اس بار کے ایڈیشن میں متعدد مقامات پر مفید اضافے اور ترمیم کیے گئے ہیں۔ کاغذ کی ہوشربا گرانی اور پلاسٹک جلد کی وجہ سے قیمت میں بھی اضافہ کرنا پڑ رہا ہے۔

ارشد القادری

مہتمم مکتبہ جامِ نور۔ فیض العلوم جمشید پور (بہار)

۷ راگست ۱۹۸۴ء

دِیباچہ

اپنی اس کتاب کا نام ''زلزلہ'' رکھتے وقت زلزلہ کا مفہوم واضح طور پر میرے ذہن میں موجود تھا۔ مجھے توقع تھی کہ کتاب افکار وتصورات کی دنیا میں تہلکہ خیز ثابت ہوگی، خیالات کے پرانے پیمانے ٹوٹیں گے، نظریات کی بنیادیں متزلزل ہوں گی، مسلمات کی عمارتوں میں شگاف پڑے گا اور اذہان کی آبادیاں تہہ وبالا ہوکر رہیں گی۔

چنانچہ جب یہ کتاب چھپ کر مارکیٹ میں آئی اور اہلِ فکر کے مختلف حلقے اس سے روشناس ہوئے تو توقعات سے کہیں زیادہ اثر پذیری کے واقعات ظہور میں آئے۔ انصاف کی نظر سے جس نے بھی اس کتاب کا مطالعہ کیا وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اپنے مواد اور طریقہ استدلال کے لحاظ سے یہ کتاب ملک کے وسیع حلقے پر اثر انداز ہوئی۔

دیوبندی علما کے بارے میں جن حضرات کو یہ خوش فہمی تھی کہ عقیدۂ توحید کے صحیح علمبردار وہی ہیں اور انبیا واولیا کے متعلق جن عقیدوں کو وہ کفر وشرک قرار دیتے ہیں وہ کسی قلبی تکدر کے نتیجے میں نہیں بلکہ عقیدۂ توحید کی حمایت کے جذبے میں ہے۔ کتاب کے مطالعہ کے بعد انھیں بھی کچھ اس طرح ذہنی تصادم سے دوچار ہونا پڑا کہ دیوبندی مذہب کے متعلق ان کے پچھلے تصورات کے سارے تاروپود بکھر گئے۔ جن خوش نصیبوں کو حق تعالیٰ نے حق قبول کرنے کی توفیق مرحمت فرمائی وہ تاریکیوں سے اُجالوں کی طرف برملا واپس لوٹ آئے۔ لیکن جن کے قلوب کے دروازے مُقفّل تھے اُنھوں نے کتاب کے مطالعہ کے ردعمل سے اپنے کو بچانے کے لیے ذہنی تسکین کا ایک نہایت گھٹیا طریقہ اختیار کیا کہ کتاب میں جتنے حوالے دیے گئے ہیں وہ صحیح نہیں ہوں گے اور انعام کا اعلان صرف دھونس جمانے کے لیے ہے۔ لیکن جب انھیں حوالے کی اصل کتابیں دکھلادی گئیں

تو ان پر ایک سکتے کی کیفیت طاری ہوگئی اور بہت دیر تک وہ محوِ حیرت رہے۔ بالآخر حُسنِ فریب کا وہ سارا طلسم ٹوٹ گیا جس میں وہ سالہا سال سے اسیر تھے۔

دیوبندی علما پر اس کتاب کا جو ردِّ عمل ہوا وہ سب سے زیادہ دلچسپ ہے۔ تقریباً سبھی حضرات نے ''مکمل خاموشی'' کو اس کا بہترین جواب قرار دیا۔ جب بھی ان کے سامنے کسی نے ''زلزلہ'' کی بات کی، انھوں نے اپنے کان بند کرلیے۔

البتہ 'ندوۃ العلماء لکھنؤ' میں جب 'علی میاں' کے سامنے 'زلزلہ' کا وہ حصہ پیش کیا گیا جس کا تعلق ان کی کتاب ''سیرت احمد شہید'' میں بیان کیے گئے ایک واقعے سے ہے تو انھوں نے اصل کتاب منگوائی، سوئے اتفاق کہیے کہ حوالے کی عبارت اور اصل کتاب کی عبارت میں دو لفظ کا فرق نکل آیا اور غضب یہ ہوا کہ 'زلزلہ' میں جو بحث اٹھائی گئی تھی اس میں ساری بحث کا وہی مرکزی نقطہ تھا۔ اب وہ چند طلبہ جو 'زلزلہ' کی حمایت میں سرگرم تھے، سیکڑوں دوسرے طلبہ کے درمیان بالکل بُدّھو بن گئے اور اُنھیں سخت ذلت وشرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔

دوسرے دن ایک طالبِ علم نے نہایت گرم اور جھلسا دینے والا خط مجھے لکھا کہ آپ نے اپنی کتاب کے صفحہ ۲۲۵ پر سید احمد شہید رائے بریلوی کے متعلق علی میاں کی کتاب ''سیرت احمد شہید'' سے جو عبارت نقل کی ہے وہ یہ ہے:

> ''ستائیسویں شب کو آپ نے چاہا کہ ساری رات جاگوں اور عبادت کروں۔ مگر عشاء کی نماز کے بعد کچھ ایسا نیند کا غلبہ ہوا کہ آپ سو گئے۔ تہائی رات کے قریب دو شخصوں نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر جگایا۔ آپ نے دیکھا کہ آپ کے داہنی طرف رسول اللہ ﷺ اور بائیں طرف حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور آپ سے فرما رہے ہیں کہ احمد جلد اُٹھ اور غُسل کر۔
>
> سید صاحب ان دونوں حضرات کو دیکھ کر دوڑ کر مسجد کے حوض کی طرف گئے، اور باوجود یہ کہ سردی سے حوض کا پانی یخ ہو رہا تھا۔ آپ نے اس

سے غسل کیا، اور فارغ ہو کر خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت ﷺ نے فرمایا کہ فرزند آج شب قدر ہے۔ یادِ الٰہی میں مشغول ہو اور دعا و مناجات کرو اس کے بعد دونوں حضرات تشریف لے گئے۔''

(سیرت سیّد احمد شہید۔ ص: ۸۴)

اس عبارت سے جو استدلال آپ نے کیا ہے وہ یہ ہے:۔

''صحت واقعہ کی تقدیر پر کوئی بھی یہ سوال کر سکتا ہے کہ عالمِ بیداری میں حضور پُر نور کی تشریف آوری کا عقیدہ کیا غیب دانی اور اختیار و تصرف کی اس قوت کو ثابت نہیں کرتا جسے کسی مخلوق میں تسلیم کرنا مولوی اسمٰعیل صاحب دہلوی نے شرک قرار دیا ہے۔ پس حضور کو اگر علمِ غیب نہیں تھا تو انہیں کیونکر معلوم ہوا کہ سیّد احمد بریلوی میرا فرزند ہے اور وہ فلاں مقام پر سو رہا ہے۔ پھر اگر حضور انور میں تصرف کی قدرت نہیں تھی تو اپنے حریم اقدس سے زندوں کی طرح کیونکر باہر تشریف لائے۔''

(زلزلہ۔ ص: ۲۱۶)

ظاہر ہے کہ اس واقعے میں بحث کی ساری بنیاد بیداری کی حالت میں واقعہ پیش آنے پر ہے اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ واقعہ بیداری کا نہیں بلکہ خواب کا ہے تو اب کسی اعتراض کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ کیوں کہ خواب میں محال سے محال چیز بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

اتنی تفصیل کے بعد اس طالبِ علم نے مجھے اطلاع دی کہ اصل کتاب میں بیان واقعے کی عبارت یوں ہے:

''تہائی رات کے قریب دو شخصوں نے ہاتھ پکڑ کر جگایا آپ نے خواب میں دیکھا۔۔۔الخ''

جب کہ آپ کی منقولہ عبارت میں ''خواب میں'' کا لفظ نہیں ہے۔ اس لیے حالتِ بیداری کی بنیاد پر جو الزام آپ نے مصنف پر عائد کیا ہے وہ سر تا سر غلط اور بے محل ہے:

اس طالبِ علم کا خط پڑھ کر مجھے تھوڑی دیر کے لیے پریشانی ضرور لاحق ہوئی لیکن حوالے کی اصل کتاب دیکھنے کے بعد فوراً زائل ہو گئی۔ الحمدللہ کہ حوالے کی عبارت[1] حرف بحرف اس اصل کتاب کے مطابق تھی، جس کے پبلشر مولانا محمد ناظم صاحب ندوی ہیں اور جو باہتمام سیّد توسل حسین، مینجر یونائیٹڈ انڈیا پریس، لکھنؤ میں چھپی ہے۔

علاوہ ازایں عبارت کے سیاق و سباق میں متعدد قرائن بھی ایسے موجود ہیں جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ واقعہ خواب کا نہیں عین حالتِ بیداری کا ہے۔ پس اگر کتاب کے کسی تازہ ایڈیشن میں ''خواب میں'' کا لفظ بڑھایا گیا ہے تو قرائن کی موجودگی میں مقام کی یہ خیانت چھپائے نہیں چھپ سکے گی۔

اب ذیل میں ان قرائن کی تفصیل ملاحظہ فرمایئے:

پہلا قرینہ: تو یہ ہے کہ صاحب مخزن کی روایت کے مطابق جو علی میاں کی کتاب کا اصل ماخذ ہے۔ جب رمضان کی اکیسویں شب کو سید صاحب، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اس عشرہ کی کس رات میں شب بیداری کر کے شب قدر کی سعادت حاصل کی جائے تو انھوں نے جواب دیا کہ اگر تمھارے حال پر اللہ کا فضل ہے تو شب قدر میں اگر تم سوتے بھی رہو گے تو اللہ تم کو جگا کر ان برکات میں شریک کر دے گا۔ چنانچہ ان کے فرمانے کے مطابق جب آپ سو گئے تو دو شخصوں نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر جگایا۔ اس لیے ثابت ہوا کہ جگانے کے بعد جو واقعہ پیش آیا وہ خواب کا نہیں بیداری کا ہے۔ ورنہ شاہ صاحب کی پیشن گوئی بالکل خلافِ واقعہ بن کے رہ جاتی ہے۔

دوسرا قرینہ: یہ ہے کہ عقلی دلالت سے بھی زیر بحث عبارت ''خواب میں'' کے اضافے کی متحمل نہیں ہے۔ کیوں کہ اضافے کے بعد عبارت یوں ہوگی،

''دو شخصوں نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر جگایا۔ آپ نے خواب میں دیکھا۔۔۔۔۔الخ''

کسی دانشور کے نزدیک یہ عبارت بالکل بے جوڑ کہی جائیگی۔ کیوں کہ جگانے کے بعد از روئے عقل جاگنا ہی متوقع ہے نہ کہ خواب میں دیکھنا۔ اس لیے ماننا پڑے گا کہ جو واقعہ پیش آیا

تھا۔ وہ خواب کا نہیں بیداری کا تھا۔

تیسرا قرینہ: یہ ہے کہ صاحب مخزن کی روایت کے مطابق سید صاحب بارہا فرمایا کرتے تھے کہ اس رات کو اللہ کے فضل سے وارداتِ عجیب اور واقعاتِ غریب دیکھنے میں آئے اور اس وقت فنا کلی اور استغراق کامل مجھے حاصل ہوا۔

سوال یہ ہے کہ جگانے کے بعد بھی اگر وہ سوتے ہی رہے تو اس میں فضلِ خداوندی کی کیا بات ہوئی اور استغراقِ کامل کی کیفیت تو بیداری ہی کی حالت میں قابل ذکر ہو سکتی ہے نیند کی حالت میں تو بھی مستغرق نظر آتے ہیں۔

چوتھا قرینہ: یہ ہے کہ صبح کو جب سیّد صاحب نے حضرت شاہ صاحب سے ملاقات کی تو دیکھتے ہی انھوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ آج کی شب تم اپنی مراد کو پہنچ گئے۔

سوال یہ ہے کہ جو شخص شب قدر میں ساری رات سوتا رہا اور رسول و صدیق صلی اللہ علیہ وسلم و رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جگانے پر بھی نہیں جاگا، اس کے متعلق یہ کہنا کہ ’تم اپنی مراد کو پہنچ گئے‘ جتنا لغو، مہمل اور مضحکہ خیز ہو سکتا ہے اظہر من الشمس ہے۔

ان ہی نکات و ابحاث پر مشتمل میں نے ندوہ کے طالب علم کو جواب لکھ کر بھیجا اور وہ لوگ خاموش ہو گئے یا مطمئن ہو گئے۔

دیوبندی علما کے گروہ میں ’مولانا عامر عثمانی مدیر ’تجلّی‘ دیوبند وہ تنہا شخص ہیں جنھوں نے نہایت جرات کے ساتھ حقائق کا سامنا کیا اور یہ محسوس کیے بغیر کہ ان کے گروہ کے لوگ اُنھیں کیا کہیں گے، انھوں نے اپنے طویل تبصرہ میں برملا اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ ’’زلزلہ‘‘ میں پیش کردہ الزامات کا جواب بڑے سے بڑا منطقی اور علامۃُ الدّہر بھی نہیں دے سکتا۔ بلکہ ’تجلّی‘ کے مئی ۱۹۷۳ء والے شمارے میں انھوں نے دارالعلوم دیوبند کے جملہ مدرسین کو للکارتے ہوئے لکھا:

> ’’ہم تو جب جانیں کہ ہمارے دارالعلوم کے کوئی بلند قامت مناظر اور علامہ ان تعریضات کا جواب لائیں جو زلزلہ نامی کتاب میں جمع کی گئی ہیں۔ مولانا ارشاد ہی یہ کام کر دیں تو ان کی کلاہِ افتخار میں چار چاند لگ جائیں گے۔‘‘
>
> (تجلّی۔ ص: ۹۵)

مولانا عامر عثمانی نے اپنے تبصرہ میں لکھا تھا کہ اصولاً اس کتاب کا جواب مولانا طیّب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند اور مولانا منظور نعمانی کو دینا چاہیے چنانچہ میں نے ان دونوں حضرات کو لکھا کہ اس کتاب میں آپ کے اکابر کے خلاف جو الزامات ہیں انھوں رفع کر کے اپنے مذہب کی وکالت کا حق ادا کیجیے۔ لیکن الزامات کا جواب تو کیا دیتے کہ میرے جوابی خط کا جواب بھی ان حضرات نے آج تک نہیں دیا۔

ابھی چند ماہ ہوئے بھیمڑی (بھیونڈی، مہاراشٹر) میں ایک مذہبی نزاع کے موقع پر علمائے اہلسنّت اور علمائے دیوبند کے چند مشاہیر آئے ہوئے تھے۔ اس وقت ’زلزلہ‘ پر مولانا عامر عثمانی کے تبصرہ کا جب ذکر آیا تو دیوبندی علمانے اپنے عوام کو یہ تاثر دیا کہ دس ہزار (۱۰,۰۰۰) روپے لے کر عامر عثمانی نے یہ تبصرہ لکھا ہے۔

ہم نے عرض کیا کہ اولاً تو یہ الزام نہایت ناپاک، سرتا سر بہتان اور دروغ محض ہے۔ ثانیاً یہ کہ مولانا عامر عثمانی کے متعلق بالفرض اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ انھوں نے رشوت لے کر اپنے مذہب کا خون کیا ہے تو یہ دیوبندی گروہ کے منہ پر دوسرا طمانچہ ہوگا کہ وہ بہر حال ہمارے نہیں آپ ہی کے گروہ کے عالم ہیں۔ ثالثاً یہ کہ عامر عثمانی پر یہ ناپاک الزام عائد کرنے کے بعد بھی کتاب کے جواب کا مطالبہ اپنی جگہ پر ہے۔

آج بھی منتظر ہوں کہ دیوبندی مذہب کا کوئی بھی لائق فرزند اُٹھ کر یا تو ’زلزلہ‘ میں پیش کیے ہوئے حوالوں کو غلط ثابت کر دے یا ان حوالوں سے جو نتائج اخذ کیے گئے ہیں اس کی غلطی واضح کرے۔ یا پھر تیسری صورت وہی ہے جو مولانا عامر عثمانی نے اپنے تبصرے میں تجویز فرمائی ہے کہ دیوبندی کتابوں کو چوراہے پر رکھ کر آگ لگا دی جائے۔

اسے سرتا سر خدا کا فضل ہی کہا جا سکتا ہے کہ میری توقعات سے کہیں زیادہ اس کتاب کو قبولِ عام اور شرف امتیاز حاصل ہوا۔ ملک کے طول و عرض میں شاید ہی کوئی خطہ ہو جہاں سے 'زلزلہ' کی مانگ نہ آئی ہو، یہاں تک کہ حجازِ مقدس، بحرین، دوبئی افریقہ اور انگلینڈ تک 'زلزلہ' کا اثر محسوس کیا گیا اور وہاں سے اس کتاب کی فرمائش آئی۔

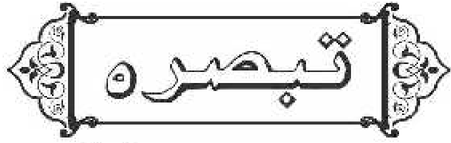
'زلزلہ' کی حمایت میں 'تجلّی' کے علاوہ متعدد ماہناموں نے مضامین شائع کیے جن میں سے قابلِ ذکر ماہنامہ "المیزان" کچھوچھہ شریف اور ماہنامہ "اعلیٰ حضرت" بریلی شریف ہیں۔ کتاب کے مطالعہ سے متاثر ہو کر بے شمار حضرات نے اپنے دعاناموں میں میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ اور اسے موضوع بحث اور بیان و استدلال کی معقولیت کے اعتبار سے وقت کی گراں بہا تصنیف قرار دیا۔

یہ بھی قبولِ عام ہی کی بات کہی جا سکتی ہے کہ یونائٹیڈ اسٹیٹ آف امریکہ کی لائبریری آف کانگریس کے ایک مراسلہ کے مطابق واشنگٹن میں اُنیس (۱۹) لائبریریوں کے تعاون سے جو دنیا کی سب سے بڑی لائبریری قائم کی جا رہی ہے اس کے منتظمین نے ہندوستانی زبان کی کتابوں میں سے نمائش کے لیے 'زلزلہ' کو منتخب کیا ہے۔

اس مراسلہ کا اردو ترجمہ اسی پیش لفظ میں کہیں ملاحظہ فرمائیے۔

قارئین کے اصرار پر مولانا عامر عثانی مدیر 'تجلّی' دیوبند کا تبصرہ بھی اپنے جواب کے ساتھ کتاب سے منسلک کر دیا گیا ہے۔ ان کے تبصرہ کے ساتھ میرا جواب بھی پڑھیے۔

★★★-----------★★★-----------★★★



مولانا عامر عثانی مدیر ماہنامہ 'تجلّی' دیوبند

زلزلہ

مصنفہ: ارشد القادری - صفحات: ۳۰۴ - کاغذ: سفید - سائز: چھوٹا -

کتابت و طباعت: معمولی - قیمت: چار روپے - مکتبہ جامِ نور فیض العلوم جمشید پور

اس کتاب کے فاضل مصنف بریلوی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمیں یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ ان کا اندازِ تحریر عام بریلوی اربابِ قلم کی معروف خامیوں سے خاصی حد تک پاک ہے اور ان کے علمِ کلام میں معقولیت کا عنصر بڑی مقدار میں پایا جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ابھی ان میں پوری پختگی نہ آئی ہو۔

کتاب کا نام کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اس افسانوی نوع کے نام نے کتاب کی علمی ثقاہت کو مجروح کیا ہے۔ کاش کوئی ایسا نام رکھا جاتا جس میں ثقاہت کے علاوہ نفسِ موضوع کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

اس کتاب میں صاحبِ کتاب نے علمائے دیوبند کی تحریروں سے یہ واضح کیا ہے کہ یہ حضرات عقائد کے معاملے میں سخت تضادات کے شکار ہیں اور جن امور کو یہ بریلویوں کے تعلق سے بدعت و شرک اور کفر وغیرہ لکھتے ہیں۔ انھیں وہ اپنے بزرگوں کے لیے عینِ ایمان قرار دیتے ہیں۔

بات اگر اس اوندھے علمِ کلام کی ہوتی جس کا مظاہرہ بریلوی مکتبِ فکر کی طرف سے بالعموم پمفلٹوں اور پوسٹروں وغیرہ میں کیا جاتا رہتا ہے تو ہم نوٹس ہی نہ لیتے۔ مگر یہ کتاب دستاویزی حقائق اور ناقابلِ تردید شواہد پر مشتمل ہے، اور فاضل مصنف اکثر و بیشتر سنجیدگی کا دامن تھامے رہے ہیں۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ ہم بے لاگ تبصرے کا فرض ادا نہ کریں۔

کتاب کی ترتیب یوں ہے کہ مصنف ایک طرف تو حضرت اسمٰعیل شہید کی ''تقویۃ الایمان'' اور بعض اور علماے دیوبند کی کتابوں سے یہ دکھلاتے جاتے ہیں کہ انبیا و اولیا کے حق میں علمِ غیب اور تصرف وغیرہ کے عقیدے کو علماے دیوبند نے شرک و بدعت اور خلافِ توحید کہا ہے اور دوسری طرف یہ دکھلاتے ہیں کہ خود اپنے بزرگوں کے حق میں یہ سارے عقائد علماے دیوبند کے یہاں موجود ہیں۔

بات یقیناً تشویش ناک ہے۔ مصنف نے ایسا ہرگز نہیں کیا ہے کہ اِدھر اُدھر سے چھوٹے موٹے فقرے لے کر ان سے مطالب پیدا کیے ہوں۔ بلکہ پوری پوری عبارتیں نقل کی ہیں اور اپنی طرف سے ہرگز کوئی معنیٰ پیدا نہیں کیے ہیں۔ اگرچہ ہم حلقۂ دیوبند ہی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ہمیں اس اعتراف میں کوئی تامل نہیں کہ اپنے ہی بزرگوں کے بارے میں ہماری معلومات میں اس کتاب نے اضافہ کیا اور ہم حیرت زدہ رہ گئے کہ دفاع کریں تو کیسے؟ دفاع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کوئی بڑے سے بڑا منطقی اور علامۃ الدّہر بھی ان اعتراضات کو دفع نہیں کرسکتا جو اس کتاب کے مشتملات متعدد بزرگانِ دیوبند پر عائد کرتے ہیں۔ ہم اگر عام روش کے مطابق اندھے مقلد اور فرقہ پرست ہوتے تو بس اتنا ہی کرسکتے تھے کہ اس کتاب کا ذکر ہی نہ کریں۔ لیکن خدا بچائے اشخاص پرستی اور گروہ بندی کی باطل ذہنیت سے، ہم اپنا دیانت دارانہ فرض سمجھتے ہیں کہ حق کو حق کہیں اور حق یہی ہے کہ متعدد علماے دیوبند پر تضاد پسندی کا جو الزام اس کتاب میں دلیل و شہادت کے ساتھ عائد کیا گیا ہے وہ اٹل ہے۔

یہ دیوبندیوں کے لٹریچر کی خاصی مشہور کتابیں۔ ارواحِ ثلٰثہ، تذکرۃ الرّشید، سوانحِ قاسمی، اشرف السوانح، الجمعیۃ کا شیخ الاسلام نمبر، انفاسِ قدسیہ وغیرہ، ان کی صورتیں دیکھنے اور

کہیں کہیں سے پڑھنے کا شاید ہمیں بھی اتفاق ہوا ہو۔ لیکن یہ ''زلزلہ'' سے منکشف ہوا کہ ان میں کیسے کیسے عجوبے اور کیسی کیسی اَن کہنیاں محفوظ ہیں۔ استغفر اللہ ثم استغفر اللہ۔ واقعہ یہ ہے کہ فحش ناول بھی اپنے قارئین کو اتنا نقصان نہیں پہنچا سکتے جتنا ان کتابوں نے پہنچایا ہوگا ان کے باقی اوراق پر چاہے حقائق اور معارف کے ڈھیر لگے ہوئے ہوں لیکن جو اقتباسات ''زلزلہ'' میں نقل کیے گئے ہیں وہ بجائے خود اس کے لیے کافی ہیں کہ سادہ لوح قارئین کی دھجیاں اُڑا دیں، اور خدا پرستی کی جگہ اُنھیں 'بزرگ پرستی' کا ایسا سبق دیں جس کے زہر کا کوئی تریاق نہ ہو۔

مصنف بار بار پوچھتے ہیں کہ علماے دیوبند کے اس تضاد کا جواب کیا ہے؟ انصاف تو یہ ہے کہ اس کا جواب مولانا منظور نعمانی یا مولانا محمد طیّب صاحب کو دینا چاہیے۔ مگر وہ کبھی نہ دیں گے کیوں کہ جو اعتراض ایک ناقابلِ تردید صداقت کی حیثیت رکھتا ہے اس کا جواب دیا بھی کیا جا سکتا ہے۔ مگر ہمیں چونکہ علماے دیوبند کی اندھی وکالت نہیں کرنی ہے، اس لیے موٹا سا جواب ہم دیتے ہیں کہ مرحوم علماے دیوبند صرف عالم ہی نہیں تھے بلکہ صوفی اور شیخ بھی تھے۔ تصوّف کتنا ہی محتاط ہو وہ اپنے ساتھ کشف و کرامات اور تحیرات و تصرفات کے طلسم خانے ضرور لاتا ہے۔ پھر یہ طلسم خانے مریدانِ باصفا کی اندھی عقیدت مندیوں اور خوش فہمیوں کی آمیزش سے تہہ در تہہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ شریعت کے محکم اصول و عقائد کے لیے ان کی حیثیت چیلنج کی ہوجاتی ہے اور قرآن و سنت کو معیار بنانے والے ناقدین کی زبانیں یہ کہنے پر مجبور ہوجاتی ہیں کہ تصوف نشہ ہے، سَفسَطہ ہے، شریعت کا دشمن ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ تذکرۃ الرشید اور سوانح قاسمی اور اشرف السوانح جیسی کتابوں سے کچھ یہ توقع رکھنی ہی نہیں چاہیے کہ وہ افسانہ تراشیوں اور مغالطوں کی آمیزش سے پاک ہوں گی۔ ارادت مند حضرات جب اپنے ممدوحوں کے تذکرے لکھتے ہیں تو ناممکن ہوجاتا ہے کہ وہ فنِ روایت کے اس اعلیٰ اور احوط معیار کا خیال رکھ سکیں جس کے ذریعے احادیث کو جانچا پرکھا جاتا ہے۔ اس لیے رونا ان مُریدانِ باصفا کا نہیں جو غیر عالم ہیں بلکہ اس وادی میں تو اچھے اچھے علامہ اور ''روشن فکر'' حضرات بھی ایک ہی رنگ میں رنگے نظر آتے ہیں۔ یہ سوانح قاسمی کے فاضل مرتب مولانا مناظر

احسن گیلانی نوراللہ مرقدہٗ کیا معمولی درجے کے عالم تھے؟ یہ تذکرۃ الرشید کے عالی قدر مرتب مولانا عاشق الٰہی میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ کیا جہلا کی صف میں تھے؟ یہ انفاس قدسیہ کے محترم مدون مفتی عزیزالرحمٰن صاحب بجنوری کیا بے پڑھے لکھے آدمی تھے؟ یہ الجمعیۃ کا شیخ الاسلام نمبر اور خواجہ غریب نواز نمبر شائع کرنے والے کیا غیر عالم ہیں؟ اور یہ ارواحِ ثلٰثہ کے مصنف امیر شاہ خاں کیا کباڑی بازار کی جنس تھے؟ نہیں، یہ سب ماشاء اللہ لائق فائق علمائے شریعت ہیں اور دوسروں کے عقائد وافکار پر اعتراضات کی بوچھار کرنے میں ان کی اہلیت مشین گن سے کم نہیں ہے۔ مگر یہی مکرم حضرات جب اپنے ممدوحوں اور بزرگوں کے احوال بیان کرنے اُٹھتے ہیں تو نقد ونظر کی ساری صلاحیتوں کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں اور یہ تک بھول جاتے ہیں کہ ہم نے کب کیا فتویٰ اور فیصلہ دیا تھا۔ خود ہم نے اور ہمارے معتقد بزرگوں نے کس قدر شدّ ومد کے ساتھ شرک اور سنّت وبدعت کے کیا کیا عقدے کھولے ہیں۔

بات سچ ہے مگر سو فیصدی درست ہے کہ دیوبندی مکتبِ فکر کے خمیر میں بھی اندھی تقلید اور مسلکی تعصبات کی اچھی خاصی مقدار گندھی ہوئی ہے۔ اس مکتب کا کم وبیش ہر عالم پہلے دن سے اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ کسی نے قرآن کو پوری طرح سمجھا ہے تو وہ ہمارے فلاں شیخ التفسیر ہیں۔ اگر علم الحدیث کی تہہ تک کوئی پہنچا ہے تو وہ ہمارے فلاں شیخ الحدیث پہنچے ہیں۔ اگر ولایت ونبوت اور طریقت وتصوف کے اسرار ومعارف پر کسی نے عبور حاصل کیا ہے تو وہ ہمارے فلاں فلاں شیوخ ہیں۔ اس خوش فہمی کے ساتھ یہ عقیدہ بھی دلوں میں جاگزیں کر لیا گیا ہے کہ وہ محفوظ عن الخطاء بھی ہیں۔ معصوم تو اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ ایک عامی بھی عصمت کو انبیا کا مخصوص وصف سمجھتا ہے مگر محفوظ کی اصطلاح کا سہارا لے کر وہ عملاً انھیں معصوم ہی تصور کیے ہوئے ہیں ان کا پختہ خیال ہے کہ ان کا ہر بزرگ زہد وتقویٰ کے علاوہ عقل ودانش میں بھی بقراط وارسطو سے کسی طرح کم ہرگز نہیں۔

شاید یہی وجہ ہے کہ مولانا حسین احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ردِّ مودودیت کی بسم اللہ کی تو اب سارے متوسلین اور اربابِ حلقہ اور اہلِ تعلق پر واجب ہو گیا کہ یہی راگ مسلسل الاپے جائیں اور ایک ایک اعتراض والزام کا جواب خواہ کتنی ہی قوت اور معقولیت کے ساتھ دے دیا گیا ہو مگر ضد اور

اندھی تقلید کے محاذ سے بے تکان وہی گڑھے گڑھائے نعرے اور ڈھلی ڈھلائی چرب زبانیاں نشر کیے جائیں۔ [1]

خیر مولانا مودودی کا اور ان صُلحا کا فیصلہ تو انشاء اللہ اب یومِ حشر میں ہوگا۔ مگر یہ کتاب ''زلزلہ'' جو نقد جواب طلب کر رہی ہے۔ اس سے عہدہ برآ ہونے کی صورت آخر کیا ہوگی۔ اپنی کسی غلطی کو تسلیم کرنا تو ہمارے آج کے بزرگانِ دیوبند نے سیکھا ہی نہیں، انھوں نے صرف یہ سیکھا ہے کہ اپنی کہے جاؤ اور کسی کی مت سنو۔ انشاء اللہ اس کتاب کے ساتھ بھی ان کا سلوک اس سے کچھ مختلف نہیں ہوگا۔

اس کتاب نے ہمیں ہمارے بزرگوں کی جن محیر العقول کرامتوں سے آگاہ کیا ہے ان کو تو خیر کیا کہیے ایک نادر اقتباس ہم یہاں ضرور نقل کریں گے جس نے ہمیں درجۂ حیرت میں ڈال دیا ہے۔

سید اسمٰعیل شہید کے بارے میں ہم یقین رکھتے تھے کہ اُنھوں نے اعلائے کلمۃ الحق کی راہ میں جان دی اور آج بھی یقین رکھتے ہیں۔ مگر یہ ہمارے مرحوم ومغفور اُستاد مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''نقشِ حیات'' میں فرماتے ہیں:

> ''سیّد صاحب کا اصل مقصد چونکہ ہندوستان سے انگریزی تسلط اور اقتدار کا قلع قمع کرنا تھا جس کے باعث ہندو اور مسلمان دونوں ہی پریشان تھے۔ اس بناء پر آپ نے اپنے ساتھ ہندوؤں کو بھی شرکت کی دعوت دی اور صاف صاف انہیں بتا دیا کہ آپ کا واحد مقصد ملک سے بدیسی لوگوں کا اقتدار ختم کرنا ہے۔ اس کے بعد حکومت کس کی ہوگی اس سے آپ کو غرض نہیں ہے جو لوگ حکومت کے اہل ہونگے ہندو یا مسلمان یا دونوں وہ حکومت کریں گے۔''
>
> (نقشِ حیات، ج:۲، ص:۱۳= زلزلہ، ص:۱۴۲)

اس پر ''زلزلہ'' کے مصنف نے جو ریمارک دیا وہ یہ ہے:

> ''آپ ہی انصاف سے بتایئے کہ مذکورہ حوالہ کی روشنی میں سیّد صاحب کے

لشکر کے متعلق سوا اس کے اور کیا رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ وہ ٹھیک انڈین نیشنل
کانگریس کے رضاکاروں کا ایک دستہ تھا جو ہندوستان میں ایک سیکولر اسٹیٹ
(لادینی حکومت) قائم کرنے کے لیے اُٹھا تھا۔"

(ص: ۱۴۲)

ہم کتنی ہی جانب داری سے کام لیں زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس ریمارک میں لفظاً تلخی آگئی ہے لیکن معنوی اور منطقی اعتبار سے بھی اس میں کوئی نقص ہے، کوئی افترا ہے، کوئی زیادتی ہے؟

کوئی شک نہیں اگر اُستادِ محترم حضرت مدنی کے ارشادِ گرامی کو درست مان لیا جائے تو حضرت اسمٰعیل کی شہادت محض افسانہ بن جاتی ہے۔ مادّی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے غیر ملکی حکومت کے خاتمے کی کوشش کرنا ذرا بھی مقدس نصب العین نہیں۔ اس نصب العین میں کافر و مومن سب یکساں ہیں۔ اس طرح کی کوشش کے دوران مارا جانا اس شہادت سے بھلا کیا تعلق رکھے گا جو اسلام کی ایک معزز ترین اور مخصوص اصطلاح ہے اور اس طرح کی کوششوں کے نتیجے میں قید و بند کی مُصیبتیں اٹھانا اجرِ آخرت کا موجب کیوں ہوگا؟

مولانا مودودی نے تصوّف کو "چُنیا بیگم" لکھ دیا تھا۔ تشبیہہ یقیناً ناروا تھی۔ اِدھر سے اُدھر تک زلزلہ آگیا۔ آج تک ہمارے مشائخ نے اُنھیں معاف نہیں کیا ہے۔ لیکن نشہ کے علاوہ اس کی توجیہ آخر کیا کریں گے کہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی یا حضرت مولانا اشرف علی جیسے بزرگ جب فتوے کی زبان میں بات کرتے ہیں تو ان احوال و عقائد کو برملا شرک، کفر اور بدعت و گمراہی قرار دیتے ہیں جن کا تعلق غیب کے علم اور روحانی تصرف اور تصورِ شیخ اور استمداد بالارواح جیسے امور سے ہے لیکن طریقت و تصوف کی زبان میں کلام کرتے ہیں تو یہی سب چیزیں عینِ کمال ولایت اور علامتِ بزرگی بن جاتی ہیں۔

اگر ہم فرض کرلیں کہ ان بزرگوں کی طرف دیگر مُصنفین نے جو کچھ منسوب کردیا ہے وہ مبالغہ آمیز ہے، غلط ہے، حقیقت سے بعید ہے تو بیشک ان بزرگوں کی حد تک ہمیں اعتراض سے خلاصی مل جائے گی۔ لیکن یہ دیگر مُصنفین بھی تو "علمائے دیوبند" ہی ہیں ان کی یہ کتابیں بھی تو حلقۂ

دیوبند ہی میں بڑے ذوق و شوق سے تلاوت فرمائی جاتی ہیں اور کسی اللہ کے بندے کی زبان پر یہ اعلان جاری نہیں ہوتا کہ ان خرافات سے ہم برات ظاہر کرتے ہیں۔ برأت کیا معنی ہمارے موجودہ بزرگ پورا یقین رکھتے ہیں کہ ان کتابوں میں علم غیب اور فریاد رسی اور تصرفات روحانی اور کشف و الہام کے جو کمالات ہمارے مرشدین کی طرف منسوب ہیں، وہ بالکل حق ہیں، سچے ہیں، پھر آخر ازالۂ اعتراض کی صورت کیا ہو؟

ہمارے نزدیک جان چھڑانے کی ایک ہی راہ ہے وہ یہ کہ یا تو تقویۃ الایمان اور فتاویٰ رشیدیہ، فتاویٰ امدادیہ اور بہشتی زیور اور حفظ الایمان جیسی کتابوں کو چوراہے پر رکھ کر آگ دے دی جائے اور صاف اعلان کردیا جائے کہ ان کے مندرجات قرآن و سنّت کے خلاف ہیں اور ہم دیوبندیوں کے صحیح عقائد ارواحِ ثلٰثہ اور سوانح قاسمی اور اشرف السوانح جیسی کتابوں سے معلوم کرنے چاہئیں۔ یا پھر ان مؤخر الذکر کتابوں کے بارے میں اعلان فرمایا جائے کہ یہ تو محض قصّے کہانیوں کی کتابیں ہیں جو رطب و یابس سے بھری ہوئی ہیں۔ اور ہمارے صحیح عقائد وہی ہیں جو اول الذکر کتابوں میں مندرج ہیں۔

"زلزلہ" کے مُصنف نے ناچیز تبصرہ نگار کا بھی ایک اقتباس تجلّی سے دیا ہے:

"ان لوگوں کو اپنے دماغ کی مرمت کرانی چاہیے جو یہ لغوترین اور احمقانہ دعویٰ
کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو علمِ غیب تھا۔"

الحمدللہ ہمیں اس اقتباس پر کوئی پچھتاوا نہیں، نہ ہمیں دفاع کی ضرورت ہے دفاع کی ضرورت تو اس وقت ہوتی جب ہم نے بھی دیوبندی بزرگ کے ایسے قول یا حال کی توثیق کی ہوتی جس سے ہمارے اس عقیدے پر حرف آتا۔ مگر الحمدللہ ہمارا دامن اس سے پاک ہے ہم ہرگز ان لوگوں میں نہیں ہیں جو شخصیت پرستی میں مبتلا ہوں ہم ارواحِ ثلٰثہ اور سوانح قاسمی جیسی کتابوں کو ذرا بھی مقدس نہیں سمجھتے۔

البتہ یہ وضاحت ہم کردیں کہ اس اقتباس میں ہم نے کیا کہنا چاہا ہے۔ ہر پڑھا لکھا آدمی جانتا ہے کہ "علمِ غیب" ایک اصطلاح ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جو چیزیں حواسِ خمسہ کے

دائرۂ عمل سے باہر ہوں اُنھیں بغیر کسی وسیلے اور ذریعہ کے جاننا۔ بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ کچھ لوگ اس بات کے مدعی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو تمام ما کان و ما یکون کا علم تھا۔ یعنی ازل سے لے کر ابد تک ہر شئی کا علم تھا۔ کچھ لوگ اتنا توسع تو نہیں برتتے مگر ان کا خیال ہے کہ حضور ان تمام مغیبات کے عالم ضرور تھے جن کا تعلق ان کی ذات یا امّت کے احوال سے ہے۔

ہمارے نزدیک پہلا گروہ تو جہالت وہ سفاہت کی آخری منزل میں ہے، اور ہمارے مذکورہ اقتباس کا ہدف فی الحقیقت یہی گروہ ہے۔ "علمِ غیب" کے حدود کی تصریح اگرچہ اس میں نہیں لیکن 'تجلّی' میں مختلف اوقات میں جو بحثیں اس موضوع پر ہوتی رہی ہیں، ان کے سیاق وسباق میں ہر طالب دیکھ سکتا ہے کہ ہم لغوترین اور احمقانہ عقیدہ علمِ غیب کلّی ہی کو قرار دیتے ہیں۔

رہا دوسرے گروہ کا عقیدہ تو یہ بھی ہمارے نزدیک پورے طور پر درست نہیں۔ ہم مانتے ہیں اور کون مسلمان ہوگا جو اسے نہ مانے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فداہ ابی و امی کو بے شمار ان مغیبات کا علم تھا جن کا علم کسی بھی امّتی کی دسترس سے باہر ہے۔ آپ دنیا کے سب سے اعلم یعنی باخبر اور جاننے والے انسان تھے۔ علوم غیبیہ کے معاملے میں آپ کے علم کو تمام امت کے مجموعی علم سے کم و بیش ایسی ہی نسبت ہے جیسے سمندر کو قطرے سے۔ لیکن اسی کے ساتھ ہمارا یہ عقیدہ اور دعویٰ بھی ہے کہ اس کثرتِ علم وخبر کے باوجود آپ پر "علمِ غیب" کی اصطلاح کو منطبق نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اصطلاح اللہ کے لیے خاص ہے۔ اور خاص اس لیے ہے کہ کسی بھی شئی کے علم میں اللہ وسائل و ذرائع کا محتاج نہیں، بلکہ ہر شئی ازل سے ابد تک کلًّا و جزءًا اس کے سامنے موجود ہے اس کے برخلاف حضورؐ کو جو علم ملا وہ وسائل و ذرائع کے توسط سے ملا۔ مثلاً آپ نے بے شمار اشیائے غیب کو آنکھوں سے دیکھا تو یہ شہود علم غیب کے دائرے کی چیز نہیں بلکہ کھلے طور پر یہ ذرائع سے مربوط ہے۔ اللہ نے جو کچھ دکھانا مناسب سمجھا اس کے لیے ذرائع استعمال فرمائے۔ ذرائع میں ملائکہ بھی شامل ہیں اور خاص الخاص قوتیں بھی، جن کا کوئی نام ہم نہیں رکھ سکتے۔ آج ایتھر اور ریڈیائی لہریں دریافت کرلی گئی ہیں جو منٹوں میں کروڑوں میل کی خبر لاتی ہیں۔ پھر کیوں نہ اسی طرح کی بلکہ ان سے زیادہ تیز اور قوی اشیا اس کائنات میں موجود ہو جن کے ذریعہ اللہ نے منٹوں میں اپنے رسول

کو آسمانوں کی سیر کرادی۔ اس سیر میں حضور کی اپنی قوت یا ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا۔

عام زندگی میں بے شمار واقعات ہیں جن سے حضورؐ کی غیب دانی کا پتہ چلتا ہے لیکن ان میں ایک بھی ایسا ثابت نہیں کیا جا سکتا جو کسی نہ کسی واسطے سے مربوط نہ رہا ہو۔ ملائکہ یا وحی یا مخفی یا کشف کی کوئی اور روحانی تکنیک، حتّٰی کہ اگر بعض علماء کی اس رائے کو قبول کرلیا جائے اور ہمارے نزدیک اسے قبول کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ انبیاء علیہم السلام کو حواسِ خمسہ کے علاوہ بھی کوئی شئے ایسی بخشی گئی تھی جس سے وہ بعض مغیبات کا ادراک کرلیتے تھے۔ اسے باطن کی آنکھ کہیے یا کوئی اور نام دیجیے۔ بہرحال یہ بھی ایک وسیلے ہی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور بلا ریب یہ ثابت ہے کہ یہ آنکھ لامحدود نہیں تھی بلکہ اس کا دائرۂ کار محدود تھا اور اسی تحدید کی وجہ سے انبیاء کی زندگی میں بے شمار واقعات ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ کچھ چیزیں، کچھ واقعات، کچھ حوادث کلًّا یا جزءًا کچھ مدت کے لیے یا زیادہ مدت کے لیے ان سے مخفی بھی رہے ہیں ایسا نہیں تھا کہ اللہ جل شانہٗ کی طرح ہر شئے ہر وقت ان کے دائرۂ علم میں ہو۔ ان کی مخفی آنکھ ان تمام اشیاء کو تو لازماً دیکھ لیتی تھی جن کا دیکھنا دعوتِ دین کی مصالح کے لیے ضرور تھا۔ یہ خاصیت اللہ ہی نے اس میں رکھی تھی تا کہ فرائضِ نبوّت میں رکاوٹ واقع نہ ہو۔ لیکن جن امور کا تعلق ان امور سے نہیں تھا انھیں دیکھتے رہنے کی زحمت اس آنکھ کو نہیں دی گئی۔

خلاصۂ کلام یہ کہ اللہ کے سوا جس نے بھی جو کچھ جانا وسائط و وسائل کے توسل سے جانا۔ یہ وسائط خواہ کتنے ہی لطیف اور مخفی اور حیران کن رہے ہوں۔ یہ بہرحال انسانی علم کو اللہ کے علمِ غیب سے جدا کرنے والے ہیں جو ہر وقت ہر شئی کو بلا واسطہ محیط ہے۔

اس سے ظاہر ہوا کہ ہم نہ تو انبیاء علیہم السّلام کی لغوی غیب دانی کے انکاری ہیں نہ اولیاء اللہ کے کشف و کرامت کو خالص افسانہ تصور کرتے ہیں۔ بلاشبہ اولیاء اللہ کو صفائے قلب کے نتیجے میں بیشمار مغیبات کا ایسا علم ہوتا ہے جسے شہود کہا جائے تو غلط نہ ہوگا اور ان کی روحانی قوتیں کسی نہ کسی حد تک تصرف کی استعداد بھی رکھتی ہیں۔ سب کے قبول کا پیمانہ ہم قرآن وسنّت کو قرار دیتے ہیں نہ کہ فرمودات مشائخ کو۔ ہمارے نزدیک کسی بڑے سے بڑے بزرگ کا حال یا قال درخورِ اعتنا نہیں ہے اگر وہ قرآن وسنّت کے عطا فرمودہ عقائد ونظریات سے متصادم ہو۔ ہم کسی امیر شاہ خاں

یا مولانا مناظر احسن گیلانی یا فلاں فلاں روایتوں کو محض اس بنا پر مثلِ وحی تصور نہیں کر لیں گے کہ یہ حضرات ہمارے بزرگوں میں داخل ہیں۔ ہم ان کے ارشاد کی حتیٰ الوسع تاویلِ حسن کریں گے، جب گنجائش نہ ہوگی تو صاف کہہ دیں گے کہ ان لوگوں کو دھوکہ لگا۔ اُنھوں نے غلط راویوں کا اعتبار کیا یا یہ خود از راہ غلط فہمی خلاف واقعہ کہانیوں کو سچ سمجھ بیٹھے یا عقیدت کے غلو نے ان کی بصیرت پر وقتی طور پر پردہ ڈال دیا۔

''زلزلہ'' کا سب سے بڑا تاثر۔ جو فی الحقیقت گمراہ کن ہے۔ عام راوی پر یہ پڑے گا کہ یہ بریلوی مکتبِ فکر جس قبوری شریعت کا حامل ہے، وہی اصلاً حق ہے اور علمائے دیوبند بھی دراصل اسی کے قائل ہیں۔ اس تاثر سے خدا کی پناہ۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ تصوف و طریقت کے دروازے سے جو بے شمار غلط خیالات و تصورات بریلوی مکتبِ فکر میں داخل ہوئے ہیں۔ اسی قسم کے بہتیرے افکار و عقائد اس حلقے میں بھی در آئے ہیں جسے دیوبندی حلقہ کہا جاتا ہے۔ عبادات و ریاضت کی کثرت، اوراد و تسبیحات کی فراوانی، کشف و کرامات کی ریل پیل، وضع قطع کا زاہدانہ اسٹائل، اور بے شمار اخلاقی فضائل کا وجود اس بات کا ضامن نہیں کہ تمام عقائد و مزعومات لازماً برحق ہوں۔ خوارج اور معتزلہ جیسے بدنام فرقوں میں بھی تاریخ بتاتی ہے کہ بڑے بڑے عابد مرتاض اور متقی حضرات گزرے ہیں۔ مگر ان کے بعض عقائد کی بناء پر علمائے سلف نے انھیں اہلسنت والجماعت میں شمار نہیں کیا اور بہت سے تشدد پسند اور تیز خو بزرگوں نے تو اُنھیں کافر ہی قرار دے ڈالا۔ اس سے ظاہر ہے کہ بریلوی یا دیوبندی بزرگ چاہے بظاہر کتنا ہی عابد و زاہد اور ولی صفت اور صاحبِ کشف و کرامت ہوں لیکن انھیں علم یا عمل کسی بھی دائرے میں معصومیت کا وصف حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے ہم بلا تکلف کہہ سکتے ہیں کہ مولانا اشرف علی یا مولانا رشید احمد گنگوہی یا مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہم کی طرف جو بعض اقوال یا احوال منسوب کیے گئے ہیں جن سے شریعت اِبا کرتی ہے تو یا تو منسوب کرنے والوں نے خطا کھائی ہے یا پھر یہی حضرات تصوف کی رَو میں کہیں کہیں ان حدودِ جائزہ سے باہر نکل گئے ہیں جنھیں خود انہیں کے فتوؤں اور تقریروں نے متعین فرمایا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

''زلزلہ'' کے مصنف کے قلم سے کہیں کہیں بڑی خوبصورت عبارتیں نکلی ہیں۔ مثلاً:

''یا پھر یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ کاروبارِ ہستی میں ان کی ذاتی خواہش اتنی دخیل اور با اثر تھی کہ اگرچہ زمین کا سینہ تپتا رہا، فصل جلتی رہی اور کاشتکاروں کی آہیں بابِ رحمت پر سر پٹکتی رہیں۔ لیکن جب تک ان کا پاخانہ تیار نہیں ہو گیا بارش کو چار و ناچار رُکنا پڑا۔''

(ص:۲۳۱)

اگر با اثر کی جگہ مؤثر کا لفظ ہوتا تو ان سطروں کو اردوئے معلّیٰ کا بے عیب نمونہ کہہ سکتے تھے۔ کہیں کہیں قلم نے زبان کے رُخ سے ٹھوکر بھی کھائی ہے۔ مثلاً:

''ان حضرات کے تئیں فقہائے حنفیہ کفر کا اطلاق جس غیب دانی پر کرتے ہیں وہ اقراری کفر اپنے تھانوی صاحب کے حق میں کتنی بشاشت کے ساتھ قبول کر لیا گیا ہے۔''

(ص:۱۳۲)

تئیں کا لفظ تقریباً متروکات میں شامل ہے۔ علاوہ اس کے ''قبول کر لی گئی ہے'' کے بجائے ''کر لیا گیا ہے۔'' کا موقع تھا کیوں کہ ''کفر'' جو مذکر ہے نہ کہ ''غیب دانی'' کہیں کہیں اسلوبِ تحریر گھٹیا ہو گیا ہے۔ مثلاً:

''اے سبحان اللہ! ذرا غلبۂ حق کی شان تو دیکھو۔''

(ص:۲۶)

''اے'' نے فقرہ کو زنانہ بنا دیا۔

اس طویل تبصرے کے بعد ہم فاضل مصنف سے بڑے دوستانہ پیرائے میں یہ گذارش کریں گے کہ اگر ممکن ہو تو وہ کسی وقت دیوبندیت اور بریلویت وغیرہ کے سارے تخیلات کو ایک طرف رکھ کر خالص طلبِ حق کے جذبے سے دین و شریعت پر غور کریں۔ یہ سمجھنا کہ فلاں مکتبِ فکر سراسر باطل ہے اور ہمارا مکتبِ فکر الف سے یا تک برحق ہے آدمی کو بے میل حقائق تک نہیں

پہنچاتا۔ ایمان واسلام کے سرچشمے قرآن وسنت ہیں نہ کہ کسی شیخ طریقت کے اقوال واعمال۔ اس سے قبل کہ ہم شاہ عبدالقادر جیلانی یا خواجہ اجمیری یا فلاں فلاں اولیاء واقطاب کے حال وقال پر وجد کریں اور عقائد کے لیے ان سے دلائل وقرائن نکالیں۔ ہمیں خالی الذہن ہو کر اللہ اور رسول کے ارشادات دستیاب ہوں، اُنھیں حرف آخر قرار دے کر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہی اصل کسوٹی ہے جس پر گھس کر کھرے اور کھوٹے کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ اور اس کسوٹی پر کھوٹا ثابت ہونے والا مال خواہ جُنید وشبلی یا عطار ورومی کا ہو وہ بہر حال کھوٹا ہے اور اس کسوٹی پر کھرا ثابت ہونے والا سکّہ خواہ خوارج معتزلہ کے بازار کا ہو وہ بہر حال کھرا ہے۔ یہی ہے اعتصام بالکتاب والسنۃ، یہی ہے وہ ذہن جس کی تربیت قرآن نے یہ کہہ کر دی ہے کہ جب معاملہ میں نزاع ہو تو اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرو۔ یہی ہے وہ اصول محکم جسے ان لفظوں میں ادا کیا جاتا ہے کہ اللہ اور رسول ہی معیارِ حق ہیں اور کوئی فرد دنیا کے پردے پر نہیں جو شریعت حقہ کے لیے کسوٹی اور دھرم کانٹے کی حیثیت رکھنے والا ہو۔

''زلزلہ'' تصنیف کرکے اگر وہ یہ یقین کر بیٹھے ہیں کہ بریلوی عقائد کی سند دیوبندی علماء سے مل جانے کے بعد بریلوی عقائد کی صحت قطعی ہوگئی ہے تو یہ ایک مغالطہ ہوگا جس میں ان جیسے معقولیت پسند کو ہرگز نہ پھنسنا چاہیے۔ غلوئے عقائد بفرق مراتب دونوں گروہوں میں ہے اور قرآن وسنت کے نصوص اس غلو پر خطِ تنسیخ کھینچتے ہیں۔ آخرت میں کم استعداد کے بے عقل لوگ تو ممکن ہے تقلید جامد کے عذر پر معاف کردیے جائیں۔ مگر موصوف جیسے فہیم اور ذی استعداد بندوں کو اس کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ ایسی توقع اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ فہم سلیم اور علم وخبر کی ناشکری ہوگی۔

★★★-----------★★★-----------★★★

1

جواب تبصرہ

مراسلہ بنام مولانا عامر عثمانی مُدیر ماہنامہ ''تجلّی'' دیوبند

وسیع الالقاب جناب مولانا عامر عثمانی، مدیر ''تجلّی'' زید کرمہ

بعد ما ھو المسنون

امید ہے کہ آپ کے مزاج بخیر ہوں گے۔

سفر حج وزیارت سے واپسی کے بعد ''زلزلہ'' پر آپ کا طویل تبصرہ پڑھا۔ اس درمیان میں کئی بار ارادہ کیا کہ آپ کو خط لکھ کر شکریہ ادا کروں۔ لیکن ہر بار کوئی نہ کوئی اہم مصروفیت حائل ہوگئی۔ آج طے کرکے بیٹھا ہوں کہ خواہ کچھ بھی ہوجائے اپنے اخلاقی فرض سے سبکدوش ہوکر ہی اٹھوں گا۔

بہر حال تبصرہ کے بعض حصوں سے اختلاف کے باوجود یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جس فراخ دلی کے ساتھ آپ نے میری کتاب کے ساتھ اعتنا فرمایا ہے اس کے لیے میری طرف سے پرخلوص شکریہ قبول فرمایئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنی جماعت کے ''محفوظ مفادات کے خلاف قلم اُٹھا کر آپ نے انتہائی جرات مندانہ کردار کا مظاہرہ کیا ہے۔ کہیں کہیں تو جذبات کے تلاطم میں آپ کے قلم کا تیور اتنا غضب ناک ہوگیا ہے کہ بس یہ آرزو مچل اُٹھی کہ کاش تحریر کو آواز مل جاتی۔

بارِ خاطر نہ ہو تو ذیل کی معروضات ملاحظہ فرمائیں جو آپ کے تبصرہ کے مطالعہ کا ایک تنقیدی جائزہ ہے۔ یقین کیجیے کہ اس کے پیچھے کسی قلمی پیکار کے آغاز کا قطعاً کوئی جذبہ نہیں ہے۔

بلکہ نیک نیتی کے ساتھ میں اپنی ذاتی واردات سے صرف اس لیے آپ کو مطلع کر رہا ہوں تا کہ آپ اپنے تبصرہ کے بعض حصوں سے متعلق میرے ردِّعمل کا اندازہ لگا سکیں۔

آپ نے اپنی جماعت کے اکابر پر میرے عائد کردہ الزامات کی صفائی میں تصوف کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

> ''مرحوم علمائے دیو بند صرف عالم ہی نہیں تھے۔ بلکہ صوفی اور شیخ بھی تھے۔ تصوف کتنا محتاط کیوں نہ ہو وہ اپنے ساتھ کشف وکرامت اور تحیرات وتصرفات کے طلسم خانے ضرور لاتا ہے۔''
>
> (تجلی: ڈاک نمبر، بابت: ماہ مئی ۷۳ء دیو بند، ص: ۹۳)

اور تصوف کی مذمت کا یہ سلسلہ اس حصے پر آ کر تمام ہوا ہے:

> ''اور قرآن وسنت کو معیار بنانے والے ناقدین کی زبانیں یہ کہنے مجبور ہو جاتی ہیں کہ تصوف ایک نشہ ہے، سَفسَطہ ہے شریعت کا دشمن ہے۔''
>
> (ص: ۹۳)

آپ کے ارشاد کے مطابق تصوف، شریعت کا اس لیے دشمن ہے کہ وہ کشف وکرامت اور تحیرات وتصرفات کے طلسم خانے اپنے ساتھ ضرور لاتا ہے۔ لیکن اسی مضمون میں دو ہی تین صفحے کے بعد آپ کے قلم سے جو یہ عبارت صفحۂ قرطاس پر ثبت ہوئی ہے اس میں بھی تو یہ طلسم خانہ اپنے پورے ساز وسامان کے ساتھ موجود ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

> ہم نہ تو انبیا علیہم السلام کی لغوی غیب دانی کے انکاری ہیں نہ اولیاء اللہ کے کشف وکرامت کو خالص افسانہ تصور کرتے ہیں۔ بلاشبہ اولیاء اللہ کو صفائے قلب کے نتیجے میں بے شمار مغیبات کا ایسا علم ہوتا ہے جسے شہود کہا جائے تو غلط نہیں۔ اور ان کی روحانی قوتیں کسی نہ کسی حد تک تصرف کی استعداد بھی رکھتی ہیں۔''
>
> (تجلی، ص: ۹۷)

آپ کی اس تحریر کے بموجب، جب اولیاء اللہ کا کشف وکرامت افسانہ نہیں بلکہ امر واقعہ ہے اور صفائے قلب کے نتیجے میں بے شمار مغیبات کا علم بھی ان کی قوت قدسیہ کا ایک جانا پہچانا معمول ہے اور روحانی قوتوں کے ذیل میں تصرفات کی استعداد بھی ان کا قرار واقعی وصف ہے تو پھر بتایا جائے کہ غریب تصوف پر اب شریعت دشمنی کا الزام کیوں کر درست ہے؟ البتہ شریعت کا دشمن ہی کسی کو قرار دینا ہے تو اُسے کیوں نہ قرار دیجیے جو اولیاء اللہ کی ذات میں یہ ''طلسم خانہ'' بطور امر واقعہ تسلیم کرتا ہے۔ اور تصوف کو موقع دیتا ہے کہ وہ اس کا اشتہار کرے۔

قرآن وسنت کو معیار بنانے والوں میں آپ کی جو ممتاز حیثیت ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔ اس لیے آپ کے متعلق یہ شبہہ بھی نہیں کیا جا سکتا کہ آپ نے اولیاء اللہ کے حق میں کشف وکرامت اور تصرف وغیب دانی سے متعلق اپنے جس مثبت عقیدے کا اظہار فرمایا ہے وہ تصوف کے زیر اثر ہوگا۔ بلکہ کہنا پڑے گا کہ اس خصوص میں جو کچھ آپ نے ارشاد فرمایا ہے وہ قرآن وسنت کے عین مطابق اور شریعتِ اسلامی کا عین مطلوب ہے۔

میری جسارت معاف فرمائیں تو عرض کروں گا کہ یہاں پہنچ کر بات الٹ گئی۔ اب شریعت کا دشمن تصوف نہیں رہا، کیوں کہ وہ جو کچھ بھی اپنے ہمراہ لاتا ہے وہ تو شریعت کا عین مطلوب ہے۔ جب صورت حال یہ ہے تو اب آپ ہی بتائیے کہ جو اسے شریعت کا دشمن کہتا ہے اسے کیا کہا جائے؟

یہاں تو آپ نے انبیا کے حق میں لغوی غیب دانی کا اعتراف کیا ہے۔ لغوی غیب دانی سے آپ کی کیا مراد ہے اسے تو آپ کے قلم سے نکلی ہوئی اس سے بھی زیادہ واضح عبارت میرے پیش نظر ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

> ''انبیاء کو اگر بعض غیب کی باتیں معلوم ہوئیں تو ان کا ذریعہ وحی یا الہام یا القاء تھا اور ہم لوگوں کا ذریعہ علم الحساب، قیاس، منطق اور علم ہیئت وغیرہ ہے۔ یہ فرق ذرائع کا فرق ہے اصل واقعہ دونوں جگہ موجود ہے یعنی غیب کا علم۔ جو واقعہ ابھی

پیش نہیں آیا کل پرسوں پیش آئے گا وہ فی الحال غیب ہی ہے۔ لہٰذا جزوی معنی میں
ہم سب بفرق مراتب عالم الغیب ہیں۔"

(تجلی: باب الاستفسار، بابت: ستمبر ۶۶ء)

اس عبارت پر فکر و اعتقاد کے مختلف گوشوں سے جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں ان سے قطع نظر کرتے ہوئے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ جو لوگ انبیا و اولیا کے حق میں علم غیب کا عقیدہ رکھتے ہیں وہ بھی لفظ عالم الغیب کے اطلاق کو خدا کے ساتھ مخصوص سمجھتے ہیں اور غیر خدا پر اس لفظ کا اطلاق حرام قرار دیتے ہیں۔

لیکن آپ نے مذکورہ بالا عبارت میں نہ صرف یہ کہ بے قید علم غیب کا عقیدہ جملہ مخلوقات کے حق میں تسلیم کرلیا ہے بلکہ لفظ 'عالم الغیب' کے اطلاق کی خصوصیت بھی خدا کے ساتھ باقی نہیں رہنے دی۔ یہی بات اگر تصوف کی زبان سے ادا ہوتی تو نہیں کہہ سکتا کہ اُس غریب کی پُشت پر کتنے تازیانے برستے۔ لیکن وہی بات آپ فرما رہے ہیں تو کون کہہ سکتا ہے کہ آپ کتاب و سنت کے معیار سے ہٹ گئے۔

تصوف کو علی الاطلاق شریعت کا دشمن کہتے ہوئے آپ کو یہ ضرور محسوس کرنا چاہیے تھا کہ اس جملے کی ضرب کہاں کہاں پڑے گی۔ میں یقین کرتا ہوں کہ آپ یہ دعویٰ کبھی ثابت نہیں کرسکیں گے۔ امام الطائفہ حضرت خواجہ حسن بصری رضی اللہ عنہ سے لے کر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تک جن جن بزرگوں نے تصوف کی آبیاری کی ہے وہ قرآن و سُنت کو معیار بنانے والوں میں نہیں تھے اور انھوں نے یکے بعد دیگرے صدیوں تک شریعت کے ایک دشمن کو اپنے سینے سے لگائے رکھا تھا۔

واضح رہے کہ چند جاہل اور مکار صوفیوں کے غلط کردار کی بنیاد پر تصوف کو شریعت کا دشمن کہنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے چند عیّار و بد اطوار علما کے غلط کردار کی بنیاد پر کوئی علم دین ہی کو شریعت کا دشمن کہنے لگے۔

تصوف کی مذمت پر اپنے دل کی بے چینیوں کے اظہار کے بعد اب ایک دلچسپ مقدمہ آپ کی عدالت میں پیش کر رہا ہوں اور آپ سے آپ ہی کے خلاف انصاف چاہتا ہوں۔ میرا گمان ہے کہ آپ کے لیے تاریخ صحافت میں شاید یہ پہلا موقع ہوگا جب آپ خود اپنے خلاف قلم اُٹھانے کی ضرورت محسوس کریں گے۔ بات کسی جاہل و بے دین صوفی کی نہیں جو قبوری شریعت پر یقین رکھتا ہے، بلکہ آپ جیسے تصوف دشمن اور توحید پرست عالم کی ہے جو کتاب و سنت ہی کو معیار حق سمجھتا ہے۔ اور بات بھی کشف و کرامت، غیب دانی اور تصرف کی نہیں جسے غیر اللہ کے حق میں آپ بھی تسلیم کرچکے ہیں۔ بلکہ بات اس سجدۂ نیاز کی ہے جس کا غیر اللہ کے حق میں حرام ہونا ہمارا اور آپ دونوں کا متفقہ عقیدہ ہے۔

بات کئی سال پیشتر کی ہے۔ شاید آپ کے حافظے میں محفوظ ہو۔ اور نہ ہو تو ۱۹۶۳ء بابت ماہ فروری ۶۳ء کے تجلی کا فائل نکالیے اور اس کے صفحہ ۵۴ پر نظر ڈالیے۔ آپ کے ایک مضمون کی بابت شاید کسی نے آپ کو لکھا تھا کہ آپ نے مولانا مودودی پر چوٹ کی ہے۔ اس کے جواب میں آپ کے قلم نے آپ کے مجروح جذبۂ عقیدت کی جو تصویر اتاری تھی وہ یہ ہے:

"وہ شخص مولانا مودودی پر کیا چوٹ کرے گا۔ جس نے مولانا مودودی کی خداداد عظمت و عبقریت کے آستانے پر دن کی روشنی میں سجود نیاز لٹائے ہوں"

(تجلی، ص: ۵۴، فروری ۶۳ء)

یقین کیجیے۔۔۔۔۔ بات کسی صوفی اور شیخ کی ہوتی تو ہم اپنے دلِ آزردہ کو سمجھا لیتے کہ تصوف چونکہ نشہ ہے، سَفسَطہ ہے شریعت کا دشمن ہے۔ اس لیے اگر خدا کا آستانہ چھوڑ کر اپنے کسی ممدوح کے آستانے پر سجودِ نیاز بجالاتا ہے تو اس میں چنداں تعجب کی بات نہیں ہے۔ کیوں کہ نشے میں بہک جانا تو انسان کی سرشت ہے۔ اور جب سود و زیاں کا شعور ہی سلب ہوگیا ہو تو کسی گناہ کے ارتکاب کے لیے رات کی تاریکی اور دن کا اُجالا دونوں برابر ہے۔

لیکن اس حادثے کا سب سے بڑا ماتم تو یہ ہے کہ مولانا مودودی کے آستانے پر سجدہ ریز پیشانی کسی بدمست صوفی کی نہیں، کسی قبر پرست مجاور کی نہیں بلکہ نظامِ شریعت کے ایک عظیم محتسب کی

ہے اور کتاب و سنّت کو معیار بنانے والے وقت کے سب سے بڑے نقاد مولانا عامر عثمانی کی ہے۔

وہاں تو ''مرحوم علمائے دیوبند'' صوفی اور شیخ تھے اس لیے سارا الزام تصوف کے سر ڈال کے بات رفع دفع کر دی گئی۔ لیکن یہاں غیرتِ اسلامی پوچھتی ہے کہ عقیدۂ توحید کے اس تازہ خون کا الزام کس کے سر ڈالا جائے؟

اور پھر غیر اللہ کے آستانے پر سجدۂ نیاز کا یہ واقعہ ایک ہی بار کا نہیں ہے کہ اسے اتفاقی حادثہ کہہ کر بات رفع دفع کر دیجیے، بلکہ کچھ ہی عرصے کے بعد پھر مولانا عامر عثمانی کی پیشانی ہم ایک اور آستانے پر سجدہ ریز دیکھتے ہیں۔ بہت ممکن ہے یہ واقعہ بھی آپ کے حافظے سے نکل گیا ہو اس لیے یاد دلائے دیتا ہوں تجلی کا حاصل مطالعہ نمبر اگر آپ کے فائل میں ہو تو اسے کھولیے اور مولانا وحید الدین خاں صاحب کی کتاب ''علم جدید کا چیلنج'' پر آپ اپنا یہ تبصرہ پڑھیے:

''اور آج جب اُن کی تازہ کتاب کو خدمتِ حق کا ایک انمول نمونہ تصور کرتے ہوئے ہم اپنے قلم کی جبینِ نیاز ان کی بارگاہ میں جھکا رہے ہیں تو یہ سجدۂ بے اختیار ان کی ذات کو نہیں، اس حق کو ہے جس کے آگے پوری کائنات خواہی نخواہی سجدہ ریز ہے۔'' (ص:۱۰)

اپنے کسی ممدوح کی بارگاہ میں سجدۂ بے اختیار کے جواز کے لیے یہ دلیل اگر قابلِ قبول ہو تو مزار کی چوکھٹ کا بوسہ لیتے ہوئے بدمست صوفی بھی تو یہی کہتا ہے کہ میری جبینِ عقیدت کا یہ خراج صاحبِ مزار کی ذات کو نہیں بلکہ اس جلوۂ حق کو ہے جس کے آگے خواہی نخواہی ساری کائنات سجدہ ریز ہے۔

پھر انصاف کا خون ہی تو یہ کہلائے گا کہ ایک ہی دلیل آپ کے حق میں صرف اس لیے قبول کر لی جائے کہ آپ تصوف کے دشمن ہیں اور صوفی کو اس لیے دار پر چڑھا دیا جائے کہ وہ غریب تصوف کا حامی ہے۔

تبصرے کے خاتمے پر آپ نے دوستانہ پیرائے میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

''یہ سمجھنا کہ فلاں مکتبِ فکر سرتاسر باطل ہے اور ہمارا اپنا مکتبِ فکر الف سے یا تک برحق ہے، آدمی کو بے میل حقائق تک نہیں پہنچاتا۔''

(تجلی: ڈاک نمبر)

معلوم نہیں کس عالم میں آپ نے یہ عجیب و غریب نکتہ سپردِ قلم فرمایا ہے۔ بات بالکل اسٹیٹ لائن کی ہے کہ کسی بھی مکتبِ فکر کو کوئی عاقل و خدا ترس آدمی یہی سمجھ کر قبول کرتا ہے کہ وہ کل کا کل برحق ہے۔ اگر اس کے علم و اعتقاد میں کل کا کل برحق نہ ہو بلکہ کچھ برحق ہو اور کچھ باطل ہو تو ظاہر ہے کہ ایسے مکتبِ فکر سے وہ منسلک ہی کیوں ہوگا۔ اور اگر اس علم و شعور کے بعد بھی وہ منسلک ہے تو بلاشبہ وہ اپنے دین میں مخلص نہیں بلکہ فاسد اغراض کا شکار ہے۔

میرا اپنے مکتبِ فکر کے بارے میں یہی اعتقاد ہے۔ البتہ آپ جس مکتبِ فکر سے وابستہ ہیں ارشاد فرمائیے کہ وہ آپ کی نظر میں کیا ہے۔ کل کا کل برحق یا بعض برحق اور بعض باطل؟ یہ آپ کہہ نہیں سکتے کہ کل کا کل برحق ہے۔ کیوں کہ یہ اپنی تکذیب آپ ہوگی۔ اس لیے کہنا پڑے گا کہ بعض باطل ہے اور بعض برحق ہے۔ اب اس الزام کا جواب آپ ہی کے ذمہ ہے کہ دیدہ و دانستہ آپ ایک ایسے مکتبِ فکر سے کیوں منسلک ہیں جس میں حق کے ساتھ باطل کی آمیزش ہے۔

باقی رہ گیا یہ سوال کہ کسی دوسرے مکتبِ فکر کو ہم سرتاسر باطل نہ سمجھیں، جب بھی یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ وہ باطل ہے، نا قابلِ قبول ہے، واجب الرد ہے۔ کیوں کہ باطل اور حق کا مجموعہ کبھی حق نہیں ہو سکتا۔

یہ نکتہ ارشاد فرمانے کے بعد آپ نے اپنے طور پر ایک نہایت دل آویز اور حکیمانہ نصیحت مجھے تحریر فرمائی ہے:

''ایمان و اسلام کے سرچشمے قرآن و سنّت ہیں نہ کہ کسی شیخ طریقت کے اقوال و اعمال۔ اس سے قبل کہ ہم شاہ عبدالقادر جیلانی یا خواجہ اجمیری یا فلاں فلاں اولیاء

واقطاب کے حال وقال پر وجد کریں اور عقائد کے لیے ان سے دلائل وقرائن نکالیں، ہمیں خالی الذہن ہو کر اللہ ورسول کے ارشاداتِ عالیہ کو مرکزِ فکر بنانا چاہیے۔"

(ص:۹۹)

یاد آتا ہے کہ مولانا مودودی نے بھی کہیں اسی طرح کے خیال کا اظہار ان لفظوں میں فرمایا ہے۔"میں نے دین کو حال یا ماضی کے اشخاص سے سمجھنے کے بجائے ہمیشہ قرآن وسنّت ہی سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔"

برا نہ مانیے تو عرض کروں کہ سُنّتِ رسول سے منحرف کرنے کے لیے جس اسپرٹ میں منکرین حدیث گفتگو کیا کرتے ہیں اور ائمۂ مجتہدین کے ساتھ ہماری ذہنی وابستگی کے خلاف اہلِ حدیث حضرات نے جو شیوہ اختیار کر رکھا ہے کم وبیش وہی طریقہ اکابر امت سے ہمیں بے تعلق کرنے کے لیے آپ حضرات استعمال فرما رہے ہیں۔

جہاں تک قرآن وسنّت اور اللہ ورسول کے ارشاداتِ عالیہ کو مرکزِ فکر بنانے کا سوال ہے اس حقیقت کبریٰ سے کسے انکار ہوسکتا ہے؟ لیکن دراصل بحث قرآن وسنت کے الفاظ وعبارت میں نہیں ان کے مدلولات ومفاہیم میں ہے۔ غیر منصوص مسائل میں دلائل کے استخراج اور نصوص کے معانی ومطالب کے تعین کا مرحلہ بغیر اشخاص ورجال کی رہنمائی کے نہیں طے پاسکتا ہے۔ خود مولانا مودودی نے بھی تو تفہیم القرآن اور تفہیم الحدیث تصنیف کر کے یہی خدمت انجام دی ہے اور آپ بھی تجلی کے باب الاستفسار میں ہر ماہ یہی فریضہ انجام دیا کرتے ہیں۔ پھر یہ کتنے قلق کی بات ہے کہ ایک طرف تو آپ حضرات ماضی کے اشخاص کے لیے یہ حق تسلیم نہیں کرتے ہیں کہ ان سے کوئی دین سمجھے اور دوسری طرف کتابیں تصنیف فرما کر خود اپنی بابت ہم سے یہ حق تسلیم کروانا چاہتے ہیں کہ دین سمجھنے کے لیے ہم آپ کی طرف رجوع کریں۔ ظاہر ہے کہ کتابوں کی تصنیف یا مسائل کے جواب میں ورق کے ورق سیاہ کرنے کا مدعا سوا اس کے اور کیا ہوسکتا ہے کہ دین سمجھنے کے لیے لوگ آپ کے ارشادات پر عمل کریں۔

پھر سوچنے کی بات یہ ہے کہ قرآن وسنّت کی تفہیم اور دین کی تشریح کے سلسلے میں مولانا

مودودی کے ذکر وصواب دید پر اعتماد کر کے یا مسائل کے جواب میں آپ کے رشحاتِ قلم پر بھروسہ کر کے اگر ہم قرآن وسنّت کے تارک قرار نہیں دیے جاسکتے تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ چند صدی پیچھے ہٹ کر قرآن وسنّت کی تفہیم اور اسلام کی تشریح کے سلسلے میں اگر ہم ماضی کے اشخاص کی اصابت رائے پر اعتماد کرلیں تو ہم پر قرآن وسنّت سے انحراف کا الزام کیوں کر عائد ہوجائے گا۔ آخر تجلی کے اسی ڈاک نمبر میں آپ ہی کے قلم سے تو یہ تحریر ثبت ہوئی ہے:

"تمام دوسرے مسلمانوں کی طرح احناف بھی قرآن وسنّت ہی کو معیار مانتے ہیں ان کا ایمان یہ ہے کہ سوائے خدا ورسول کے کسی کا اتباع واجب نہیں اور فقہاء کی تقلید خدا ورسول ہی کے احکام تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔"

(ص:۲۶)

کتنی عجیب بات ہے کہ جس طنز کا جواب آپ نے اپنی اس تحریر کے ذریعے دے کر ایک قابلِ تحسین خدمت انجام دی ہے۔ وہی طنز ہم پر دُہراتے ہوئے آپ کو ذرا بھی زحمت پیش نہیں آئی۔

میں تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ خدانخواستہ حضرت غوث اعظم جیلانی اور حضرت خواجہ بزرگ اجمیری اور دیگر اولیا واقطاب رضوان اللہ علیہم اجمعین کی طرف سے آپ کے دل میں تکدر کا کوئی جذبہ موجود ہے۔ لیکن اتنی بات کہنے کی اجازت ضرور چاہوں گا کہ قرآن وسنّت کی تفہیم اور دین کی تشریح کے سلسلے میں آپ کے نزدیک ان بزرگوں کی اتنی بھی حیثیت نہیں ہے جتنی تفہیم القرآن اور تفہیم الحدیث کے مصنّف کی، یا تجلی کے باب الاستفسار کے مجیب کی۔

ویسے اس شکایت کے باوجود آپ کے قلم کا یہ حق اپنی جگہ پر ہے کہ دین کی تفہیم وتشریح کے سلسلے میں ان بزرگوں کے متعلق قرآن وسنّت سے انحراف کی کوئی روایت آپ تک پہنچی ہو تو برملا اس کی نشاندہی فرمایئے یا ہم نے قرآن وسنّت کے خلاف ان کے کسی قول کو اپنا مرکزِ فکر بنالیا ہو تو اسے بھی متعین طور پر واضح کیجیے۔

قرآن وسنّت کو کسوٹی کی حیثیت میں پیش کرتے ہوئے آپ نے تحریر فرمایا ہے:

"اس کسوٹی پر کھوٹا ہونے والا مال خواہ جُنید وشبلی یا عطار ورومی کا ہو وہ بہر حال

کھوٹا ہے اور اس کسوٹی پر کھرا ثابت ہونے والا سکّہ خواہ خوارج ومعتزلہ کے بازار کا ہو وہ بہر حال کھرا ہے۔''

اس عبارت میں بیان کا پس منظر چاہے کتنا ہی درست کیوں نہ ہو لیکن اندازِ بیان نہایت دلخراش اور پُرشوخ جسارت کا حامل ہے۔ ہر چند کہ تمثیل کے لیے مفروضات کا میدان بہت وسیع ہے۔ لیکن اس تمثیلی تقابل میں اظہار مقصود سے زیادہ ازالہ حیثیت عرفی کا جذبہ نمایاں ہو گیا ہے۔

کاش! آپ کا قلم حقائق کی تعبیر میں شیوۂ آداب کا بھی لحاظ رکھتا تو یقین کیجیے کہ آپ کے قلمدان کے بجائے مومنین کے قلوب میں اس کے لیے جگہ ہوتی۔

آپ نے اپنے تبصرے کے آخری پیرائے میں مجھے نصیحت کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

''زلزلہ'' تصنیف کرکے اگر وہ (یعنی مصنف) یہ یقین کر بیٹھے ہیں کہ بریلوی عقائد کی سند دیوبندی علماء سے مل جانے کے بعد بریلوی عقائد کی صحت قطعی ہوگئی تو یہ ایک مغالطہ ہوگا۔ جس میں ان جیسے معقولیت پسند کو ہرگز نہ پھنسنا چاہیے۔ غلوے عقائد بفرقِ مراتب دونوں گروہوں میں ہیں۔''

خدا شاہد ہے کہ ''زلزلہ'' تصنیف کرتے وقت یہ بات میرے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں تھی کہ میں دیوبندی علما سے اپنے عقائد کی سند حاصل کرنے جا رہا ہوں۔ بلکہ اس کتاب کی تصنیف سے میرا مدعا صرف اتنا تھا اور ہے کہ دیوبندی علما جو توحید وسنّت کے تنہا اجارہ دار بن کر دوسروں کو مشرک سمجھتے ہیں انھیں دُنیا کے سامنے اچھی طرح بے نقاب کر دیا جائے کہ اپنے کردار کے آئینہ میں وہ خود کتنے بڑے مشرک ہیں۔ جیسا کہ اپنی کتاب کے صفحہ ۳۱ پر میں نے اس خیال کا اظہار بھی کیا ہے۔ میرے الفاظ یہ ہیں:

''سچ پوچھیے تو اسی طرح کی خود فریبیوں کا جادو توڑنے کے لیے میرے ذہن میں زیرِ نظر کتاب کی ترتیب کا خیال پیدا ہوا کہ اصحابِ عقل وانصاف واضح طور پر یہ محسوس کرلیں کہ جو لوگ دوسروں پر شرک کا الزام عائد کرتے ہیں وہ

اپنے نامۂ اعمال کے آئینہ میں خود کتنے بڑے مُشرک ہیں؟''

اور خدا کا شکر ہے کہ کتاب کے مطالعہ سے لاکھوں افراد نے اپنے خیالات کی اصلاح کی ہے اور بے شمار اشخاص نے دیوبندی مکتبِ فکر کے متعلق اپنے حسنِ ظن کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ کتاب کی اشاعت کو ایک سال سے زائد کا عرصہ ہو گیا لیکن ملک کے طول وعرض سے ایک تحریر بھی مجھے ایسی نہیں موصول ہوئی جس میں یہ چیلنج کیا گیا ہو کہ کتاب کے حوالے غلط دیئے گئے ہیں یا ان حوالوں سے جو میں نے نتائج اخذ کیے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں۔ آپ نے بھی تذکیر وتانیث وغیرہ کی غلطی کے علاوہ جو دراصل کتابت کی غلطی ہے۔ حوالہ جات اور کتاب کے مرکزی فکر کے متعلق اپنے کسی اختلاف کا اظہار نہیں فرمایا ہے۔

اب باقی رہ گیا اپنے عقائد کی صحت کے لیے سند تلاش کرنے کا مرحلہ تو اس کی احتیاج انہیں لوگوں کو پیش آسکتی ہے جو بے سند ہوں اور یہاں تو خدا کا شکر ہے کہ ائمہ دین وملّت کے توسط سے کتاب وسنّت کی سند بہت پہلے سے ہمارے پاس موجود ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے اب مزید کسی سند کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اور وہ بھی معاذ اللہ علمائے دیوبند کی سند جو خود الزامات کی زد میں ہیں۔

جذبات کی رَو میں خط بہت طویل ہو گیا۔ جس کے لیے معذرت چاہتا ہوں زندگی نے وفا کیا تو پھر ملاقات ہوگی۔

آپ کا مخلص

ارشد القادری

مکتبہ جامِ نور، جمشید پور

۵ رجب المرجب ۱۳۹۳ھ

★★★------------★★★------------★★★



حکومت امریکہ بابت ''زلزلہ''

یونائیٹڈ اسٹیٹ لائبریری آف کانگریس

مسٹر ارشد القادری

مکتبہ جامِ نُور۔ جمشید پور

مصنف ''زلزلہ''

عالی جناب!

لائبریری آف کانگریس، دیگر انیس (۱۹) تحقیقاتی لائبریریوں کے لیے جو ریاستہائے متحدہ امریکہ میں کام کررہی ہے۔ یہ ادارہ قائم کیا گیا ہے۔ اس ادارہ میں تمام امریکی دارالمطالعے شرکت کررہے ہیں۔ اس پروگرام میں شامل ہونے والے تمام امریکی دارالمطالعے واشنگٹن کی لائبریری آف کانگریس میں ایک مرکزی فہرست مرتب کرنے کا منصوبہ رکھتے ہیں۔ متحدہ کوشش سے یہ ممکن ہے کہ تمام شامل ہونے والے دارالمطالعے اپنے قارئین کے لیے ہندوستانی کتابیں منظرِ عام پر لاسکیں۔

ہم نے ''زلزلہ'' نام کی ایک کتاب حاصل کی ہے جس کے مصنف آپ ہیں۔ اس کتاب کو فہرست میں ترتیب دینے کے لیے ہمیں چند معلومات کی ضرورت ہے جو ہمیشہ ''ان لینڈ'' پر

فراہم کی جائیں گی۔ یہ معلومات آپ کے نام کو امریکی دارالمطالعہ کی فہرست میں دوسرے ناموں سے ممتاز کرنے کے لیے استعمال کی جائیں گی۔ چونکہ ہم بذاتِ خود آپ کی تصنیف کے متعلق کوئی صحیح معلومات ترتیب نہیں دے سکتے، اس لیے ساتھ والے فارم کو اگر آپ اپنی اولین فرصت میں پُر کر کے ارسال کردیں تو عین نوازش ہوگی۔

مسز ای۔ ایس۔ گپتا

اسسٹنٹ فیلڈ ڈائریکٹر لائبریری آف کانگریس

(پی۔ ایل۔ نمبر ۴۸۰ پروگریمس ساؤتھ ایشیا)

★★★------------★★★------------★★★

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

سببِ تالیف

میری یہ کتاب کسی خاص عنوان پر کوئی فنی تصنیف نہیں ہے بلکہ یہ ایک استغاثہ ہے جسے میں نے قوم کی عدالت میں پیش کیا ہے۔ استغاثہ کا مضمون یہ ہے کہ ہندو پاک میں مسلمانوں کی عظیم اکثریت انبیا و اولیا کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتی ہے کہ خدا نے ان نفوسِ قدسیہ کو غیبی علم وادراک کی مخصوص قوت عطا کی ہے جس کے ذریعے انھیں مخفی اُمور اور چھپے ہوئے احوال کا انکشاف ہوتا ہے۔

یوں ہی خدائے قدیر نے انھیں کاروبارِ ہستی میں تصرف کا بھی اختیار مرحمت عطا فرمایا ہے جس کے ذریعے وہ مصیبت زدوں کی دستگیری اور مخلوق کی حاجت روائی فرماتے ہیں۔

اب اس سلسلے میں علمائے دیوبند کا کہنا ہے کہ انبیا واولیا کے حق میں اس طرح کا عقیدہ رکھنا شرک اور کفر ہے۔ خدا نے نہ انہیں علمِ غیب عطا کیا ہے اور نہ تصرف کا کوئی اختیار بخشا ہے۔ وہ معاذ اللہ بالکل ہماری طرح مجبور، بے خبر اور نادان بندے ہیں۔ خدا کی چھوٹی یا بڑی کسی مخلوق میں بھی جو اس طرح کی کوئی قوت تسلیم کرتا ہے وہ خدا کی صفات میں اُسے شریک ٹھہراتا ہے۔ ایسا شخص توحید کا مخالف اسلام کا منکر اور قرآن وحدیث کا باغی ہے۔

استغاثہ پیش کرنے کا موجب یہ امر ہے کہ علمائے دیوبند کا یہ مسلک اگر قرآن وحدیث پر مبنی ہے تو انھیں ہر حال میں اس پر قائم رہنا چاہیے تھا۔ جن عقیدوں کو انھوں نے انبیا واولیا کے حق

میں شرک سمجھا تھا۔ انھیں ساری مخلوق کے حق میں شرک سمجھنا چاہیے تھا۔ لیکن یہ کیسا اندھیر ہے اور عقیدۂ توحید کے خلاف یہ کتنی شرم ناک سازش ہے کہ ایک طرف وہ جن باتوں کو قرآن وحدیث کے حوالے سے انبیا واولیا کے حق میں شرک اور مخالف توحید قرار دیتے ہیں دوسری طرف وہ ان ہی باتوں کو اپنے گھر کے بزرگوں کے حق میں عینِ اسلام قرار دیتے ہیں۔

اس کتاب کے مندرجات کے ذریعے، میں مسلمانوں کی عدالت سے صرف اس بات کا فیصلہ چاہتا ہوں کہ جن باتوں کو علمائے دیوبند انبیا واولیا کے حق میں شرک قرار دیتے ہیں، اگر قرآن وحدیث کی رُو سے واقعتاً وہ شرک ہیں تو پھر اُنھوں نے اپنے گھر کے بزرگوں کے حق میں اُسے کیوں جائز ٹھہرا لیا ہے۔ اور اگر قرآن وحدیث کی رُو سے وہ شرک نہیں ہیں، تو انبیا واولیا کے حق میں اُنھوں نے کیوں اسے شرک قرار دیا ہے؟

تصویر کے پہلے رُخ میں دیوبندی لٹریچر کے حوالے سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ دیوبندی حضرات انبیا واولیا کے حق میں علمِ غیب اور قدرت وتصرف کا عقیدہ شرک اور منافی توحید سمجھتے ہیں۔ اور تصویر کے دوسرے رُخ میں اُنہی کتابوں کے حوالے سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ علمائے دیوبند اپنے گھر کے بزرگوں کے حق میں علمِ غیب اور قدرت وتصرف کا عقیدہ شرک اور منافی توحید نہیں سمجھتے ہیں۔

ارشد القادری

یکم ربیع الاوّل ۱۳۹۲ھ

★★★------------★★★------------★★★

تصویر کا پہلا رُخ

دیوبندی جماعت کے امامِ اوّل مولوی اسمٰعیل صاحب فرماتے ہیں:

(۱) ''جوکوئی یہ بات کہے کہ پیغمبرِ خدا یا کوئی امام یا بزرگ غیب کی بات جانتے تھے اور شریعت کے ادب سے منہ سے نہ کہتے تھے سو وہ بڑا جھوٹا ہے بلکہ غیب کی بات اللہ کے سوا کوئی جانتا ہی نہیں۔''

(تقویۃ الایمان، ص:۲۷)

(۲) ''کسی انبیاء، اولیاء یا امام وشہید کی جناب میں ہرگز یہ عقیدہ نہ رکھے کہ وہ غیب کی بات جانتے ہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی یہ عقیدہ نہ رکھے اور نہ اُن کی تعریف میں ایسی بات کہے''

(تقویۃ الایمان، ص:۲۶)

(۳) ''جوکوئی یہ دعویٰ کرے کہ میرے پاس ایسا کچھ علم ہے جب میں چاہوں اس سے غیب کی بات معلوم کرلوں اور آئندہ باتوں کو معلوم کر لینا میرے قابو میں ہے، سو وہ بڑا جھوٹا ہے کہ دعویٰ خدائی کا کرتا ہے۔ اور جو کوئی کسی نبی، ولی یا جن وفرشتہ کو امام یا امام زادے یا پیر وشہید، نجومی، رمّال یا جفار کو یا فال دیکھنے والے کو یا برہمن اشٹی کو یا بھوت و

پری کو ایسا جانے اور اس کے حق میں یہ عقیدہ رکھے سو وہ مشرک ہوجاتا ہے۔''

(تقویۃ الایمان، ص:۲۱)

(۴) ''اور اس بات میں (یعنی غیب کی بات نہ جاننے میں) اولیا، انبیا اور جن وشیطان اور بھوت وپری میں کچھ فرق نہیں۔''

(تقویۃ الایمان، ص:۸)

(۵) ''جوکوئی کسی کا نام اُٹھتے بیٹھتے لیا کرے اور دور ونزدیک سے پکارا کرے۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔ یا اُس کی صورت کا خیال باندھے اور یوں سمجھے کہ جب میں اُس کا نام لیتا ہوں زبان سے یا دل سے یا اُس کی صورت کا یا اُس کی قبر کا خیال باندھتا ہوں تو وہیں اُس کو خبر ہوجاتی ہے اور اُس سے میری کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی، اور جو مجھ پر احوال گزرتے ہیں جیسے بیماری وتندرستی وکشائش وتنگی، مرنا وجینا، غم وخوشی، سب کی اُسے ہر وقت خبر رہتی ہے اور جو بات میرے منہ سے نکلتی ہے وہ سب سُن لیتا ہے اور جو خیال ووہم میرے دل میں گزرتا ہے وہ سب سے واقف ہے، سو ان باتوں سے مشرک ہوجاتا ہے اور اس قسم کی باتیں سب شرک ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ خواہ یہ عقیدہ انبیاء اولیاء سے رکھے خواہ پیر وشہید سے خواہ امام وامام زادے سے خواہ بھوت وپری سے پھر خواہ یوں سمجھے کہ یہ بات ان کو اپنی ذات سے ہے خواہ اللہ کے دینے سے، غرض اس عقیدے سے ہر طرح شرک ثابت ہوگا۔''

(تقویۃ الایمان، ص:۱۰)

(۶) ''کچھ اس بات میں بھی ان کو بڑائی نہیں ہے کہ اللہ صاحب نے غیب دانی اختیار میں دے دی ہو کہ جس کے دل کا احوال جب چاہیں معلوم کرلیں کہ وہ جیتا ہے یا مرگیا یا کس شہر میں ہے یا جس کی آئندہ بات کو جب ارادہ کرلیں دریافت کرلیں کہ فلاں کے یہاں اولاد ہوگی یا نہ ہوگی یا اس سوداگری میں اُسے فائدہ ہوگا یا نہ ہوگا۔ اس لڑائی میں فتح پاوے گا یا شکست، کہ ان سب باتوں میں بھی سب بندے بڑے ہوں یا چھوٹے یکساں

بے خبر ہیں اور نادان ہیں۔''

(تقویۃ الایمان، ملخصاً، ص:۲۵)

(۷) ''اللہ صاحب نے پیغمبر صلعم کو فرمایا کہ لوگوں سے یوں کہہ دیویں کہ غیب کی بات سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں جانتا نہ فرشتہ، نہ آدمی، نہ جن، نہ کوئی چیز یعنی غیب کی بات کو جان لینا کسی کے اختیار میں نہیں ہے

(تقویۃ الایمان، ص:۲۵)

(۸) ''سو انھوں نے (یعنی رسولِ خدا نے) بیان کر دیا کہ مجھ کہ نہ کچھ قدرت ہے نہ کچھ غیب دانی میری قدرت کا حال تو یہ ہے کہ اپنی جان تک کے بھی نفع ونقصان کا مالک نہیں تو دوسرے کا تو کیا کر سکوں؟ اور غیب دانی اگر میرے قابو میں ہوتی تو پہلے ہر کام کا انجام معلوم کر لیتا۔ اگر بھلا معلوم ہوتا تو اس میں ہاتھ ڈالتا اگر برا معلوم ہوتا تو کاہے کو اس میں قدم رکھتا۔ غرض کہ کچھ قدرت اور غیب دانی مجھ میں نہیں اور کچھ خدائی کا دعویٰ نہیں فقط پیغمبری کا مجھ کو دعویٰ ہے۔''

(تقویۃ الایمان، ص:۲۴)

(۹) ''جو اللہ کی شان ہے اس میں کسی مخلوق کو دخل نہیں۔ سو اس میں اللہ کے ساتھ کسی مخلوق کو نہ ملاؤ۔ گو کتنا ہی بڑا ہو اور کتنا ہی مقرب۔ مثلاً یوں نہ بولے کہ اللہ ورسول چاہے گا تو فلانا کام ہو جائے گا کہ سارا کاروبار جہان کا اللہ ہی کے چاہنے سے ہوتا ہے رسول کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ یا کوئی شخص کہے کہ فلاں کے دل میں کیا ہے، یا فلاں کی شادی کب ہوگی، یا فلاں درخت میں کتنے پتے ہیں، یا آسمان میں کتنے ستارے ہیں تو اس کے جواب میں یہ نہ کہے کہ اللہ ورسول ہی جانے کیوں کہ غیب کی بات اللہ ہی جانتا ہے رسول کو کیا خبر؟''

(تقویۃ الایمان،ص:۵۸)

-----------★★★-----------

دیوبندی جماعت کے دینی پیشوا مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی لکھتے ہیں:

(۱۰) ''جو شخص اللہ تعالیٰ جلّ شانہٗ کے سوا علمِ غیب کسی دوسرے کو ثابت کرے۔۔۔۔ ۔۔۔۔ وہ بے شک کافر ہے۔ اس کی امامت اور اس سے میل جول، محبت ومودت سب حرام ہے۔''

(فتاویٰ رشیدیہ، ج:۲، ص:۱۴۱)

(۱۱) ''علمِ غیب خاصہ حق جلّ شانہٗ ہے''

(فتاویٰ رشیدیہ، ج:۱، ص:۲۰)

(۱۲) ''اور یہ عقیدہ رکھنا کہ آپ (یعنی حضور ﷺ کو) علمِ غیب تھا صریح شرک ہے۔''

(فتاویٰ رشیدیہ، ج:۲، ص:۱۴۱)

(۱۳) ''اثبات علمِ غیب غیرِ حق تعالیٰ کو صریح شرک ہے۔''

(فتاویٰ رشیدیہ، ج:۳، ص:۱۷)

(۱۴) ''جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عالم الغیب ہونے کا معتقد ہے، وہ ساداتِ حنفیہ (یعنی ائمہ احناف) کے نزدیک قطعاً مشرک وکافر ہے۔''

(فتاویٰ رشیدیہ، ج:۳، ص:۴۲)

(۱۵) ''علمِ غیب خاصہ حق تعالیٰ کا ہے اس لفظ کو کسی تاویل سے دوسرے پر اطلاق کرنا ایہامِ شرک سے خالی نہیں۔''

(فتاویٰ رشیدیہ، ج:۳، ص:۴۳)

(۱۶) ''جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علمِ غیب جو خاصہ حق تعالیٰ ہے ثابت کرے اُس کے پیچھے نماز نادرست ہے لانہ کفر کیوں کہ یہ کفر ہے۔''

(فتاویٰ رشیدیہ، ج:۳، ص:۱۲۵)

(۱۷) ''جب انبیاء علیہم السلام کو بھی علمِ غیب نہیں ہوتا تو یارسول اللہ کہنا بھی ناجائز ہوگا''

(فتاویٰ رشیدیہ، ص:۳۰)

----------★★★----------

دیوبندی جماعت کے دینی پیشوا مولوی اشرف علی صاحب تھانوی لکھتے ہیں:

(۱۸) ''کسی بزرگ یا پیر کے ساتھ یہ عقیدہ رکھنا کہ ہمارے سب حال کی اس کو ہر وقت خبر رہتی ہے۔'' (کفر و شرک ہے)

(بہشتی زیور، ج:۱، ص:۲۷)

(۱۹) ''کسی کو دور سے پکارنا اور یہ سمجھنا کہ اس کو خبر ہوگئی۔'' (کفر و شرک ہے)

(بہشتی زیور، ج:۱، ص:۳۷)

(۲۰) ''بہت سے اُمور میں آپ کا (یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا) خاص اہتمام سے توجہ فرمانا اور فکر و پریشانی میں واقع ہونا اور باوجود اس کے پھر مخفی رہنا ثابت ہے۔ قصہ افک میں آپ کی تفتیش و استکشاف بالیغ وجوہ صحاح میں مذکور ہے مگر صرف توجہ سے انکشاف نہیں ہوا۔''

(حفظ الایمان: ص:۱۶)

(۲۱) ''یا شیخ عبدالقادر، یا شیخ سلیمان کا وظیفہ پڑھنا جیسا عوام کا عقیدہ ہے اُن کے مرتکب ہونے سے بالکل اسلام سے خارج ہوجاتا ہے مشرک بن جاتا ہے۔''

(فتاویٰ امدادیہ، ج:۴، ص:۵۶)

----------★★★----------

دیوبندی جماعت کے دینی پیشوا مولوی عبدالشکور صاحب کاکوروی لکھتے ہیں:

(۲۲) ''فقہ حنفی کی معتبر کتابوں میں بھی سوائے خدا کے کسی کو غیب داں جاننا اور کہنا ناجائز لکھا ہے۔ بلکہ اس عقیدے کو کفر قرار دیا ہے۔''

(تحفۂ لاثانی، ص:۳۷)

(۲۳) ''حنفیہ نے اپنی فقہ کی کتابوں میں اس شخص کو کافر لکھا ہے جو یہ عقیدہ رکھے کہ نبی غیب جانتے تھے۔''

(تحفۂ لاثانی، ص:۳۸)

(۲۴) ''رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ والا میں صفتِ علمِ غیب ہم نہیں مانتے اور جو مانے اُسے منع کرتے ہیں۔''

(نصرتِ آسمانی، ص:۲۷)

(۲۵) ''ہم یہ نہیں کہتے کہ حضورؐ غیب جانتے تھے یا غیب داں تھے۔ بلکہ یہ کہتے ہیں کہ حضور کو غیب کی باتوں پر اطلاع دی گئی۔ فقہائے حنفیہ کفر کا اطلاق اسی غیب دانی پر کرتے ہیں نہ کہ اطلاع یابی پر۔''

(فتح حقانی، ص:۲۵)

----------★★★----------

دیوبندی جماعت کے دینی پیشوا قاری طیّب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند لکھتے ہیں:

(۲۶) ''رسول اور اُمت رسول اس حد تک مشترک ہیں کہ دونوں کو علمِ غیب نہیں ہے۔''

(فاران کا توحید نمبر، ص:۱۱۴)

(۲۷) ”حضرت سیّد الاوّلین والآخرین کے لیے علمِ غیب کا دعویٰ اور وہ بھی علمِ کلّی اور علم مَاکَانَ وَمَایَکُوْن کی قید کے ساتھ نہ صرف بے دلیل اور بے سند ہے بلکہ مخالف دلیل، معارضِ قرآن اور اس توحیدی شریعت کے مزاج کے خلاف ہونے کی وجہ سے ناقابلِ التفات ہے۔“

(توحید نمبر، ص:۱۱۷)

(۲۸) ”کتاب و سنّت کو سامنے رکھ کر علم کی تقسیم یوں نہ ہوگی کہ اللہ کا علم ذاتی رسولوں کا علم عطائی، یعنی نوعی فرق کے ساتھ دونوں کا علم برابر ہے۔ گویا ایک حقیقی خدا ایک مجازی خدا۔“

(توحید نمبر، ص:۱۲۱)

(۲۹) ”یہ آیت تا قیامت یہی اعلان کرتی رہے گی کہ آپ کو علمِ غیب نہ تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ قیامت تک آپ کو علمِ غیب نہ ہوگا۔“

(توحید نمبر، ص:۱۲۶)

----------★★★----------

دیوبندی جماعت کے دینی پیشوا مولوی منظور صاحب نعمانی

لکھتے ہیں:

(۳۰) ”جس طرح محبتِ عیسوی کے پردے میں الوہیتِ مسیح کے عقیدے نے نشو نما پائی اور جیسے کہ حُبِّ اہلبیت کے نام پر رفض کو ترقی ہوئی۔ اسی طرح حُبِّ نبوی اور عشقِ رسالت کا رنگ دے کر مسئلہ علمِ غیب کو بھی فروغ دیا جارہا ہے اور بے چارے عوام محبت کا ظاہری عنوان دیکھ کر برابر اس پر ایمان لا رہے ہیں۔“

(الفرقان، شمارہ نمبر ۵، ج:۶، ص:۱۱)

(۳۱) ”چونکہ عقیدۂ علمِ غیب کا یہ زہر محبت کے دودھ میں ملا کر اُمت کے حلقوں سے پلایا جارہا ہے۔ اس لیے ان تمام گمراہانہ اعتقادات سے زیادہ خطرناک اور توجہ کا

محتاج ہے۔ جن پر محبت و عقیدت کا ملمع نہیں کیا گیا ہے۔“

(الفرقان، شمارہ نمبر ۵، ج:۶، ص:۱۳)

(۳۲) ”صحیح بخاری شریف میں حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مفاتیح الغیب جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا وہ پانچ چیزیں ہیں، جو سورۂ لقمان کی آخری آیت میں مذکور ہیں یعنی قیامت کا وقتِ مخصوص، بارش کا ٹھیک وقت کہ کب نازل ہوگی، مَافِی الْاَرْحَام یعنی عورت کے پیٹ میں کیا ہے بچہ ہے یا بچی، مستقبل کے واقعات، موت کا صحیح مقام۔“

(فتح بریلی کا دلکش نظارہ، ص:۵۸)

----------★★★----------

دیوبندی جماعت کے دینی پیشوا مولوی خلیل احمد صاحب انبیٹھوی

لکھتے ہیں:

(۳۳) ”ملک الموت سے افضل ہونے کی وجہ سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ کا علم اُن اُمور (یعنی رُوئے زمین) کے بارے میں ملک الموت کے برابر بھی ہو چہ جائیکہ زیادہ۔“

(براہینِ قاطعہ، ص:۵۲)

(۳۴) ”شیخ عبدالحق روایت کرتے ہیں کہ مجھ کو (یعنی رسولِ خدا کو) دیوار کے پیچھے کا بھی علم نہیں ہے۔“

(براہینِ قاطعہ، ص:۵۱)

(۳۵) ”بحرائق، عالمگیری، درمختار وغیرہ میں ہے کہ اگر کوئی نکاح کرے بہ شہادت حق تعالیٰ و فخرِ عالم علیہ السلام کے تو کافر ہوجاتا ہے۔ بہ سبب اعتقادِ علمِ غیب کے فخرِ عالم کی بہ نسبت۔“

(براہینِ قاطعہ، ص:۴۲)

----------★★★----------

دیوبندی جماعت کے متفرق حضرات کی عبارتیں:

(۳۶) ''ان لوگوں کو اپنے دماغ کی مرمت کرانی چاہیے جو یہ لغوترین اور احمقانہ دعویٰ کرتے ہیں کہ رسول اللہ کو علمِ غیب تھا۔''

(عامر عثانی، تجلی دیوبند، بابت: دسمبر ۱۹۶۰ء)

(۳۷) ''الوہیّت اور علمِ غیب کے درمیان ایک ایسا گہرا تعلق ہے کہ قدیم ترین زمانے سے انسان نے جس ہستی میں بھی خدائی کے کسی شائبے کا گمان کیا ہے۔ اس کے متعلق یہ خیال ضرور کیا ہے کہ اس پر سب کچھ روشن ہے اور کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں۔''

(مولانا مودودی، الحسنات، رام پور)

(۳۸) ''حضرت یعقوب علیہ السلام برگزیدہ پیغمبر تھے۔ مگر برسوں تک اپنے پیارے اور چہیتے بیٹے یوسف کی خبر نہ معلوم کر سکے کہ اُن کا نورِ نظر کہاں ہے۔ اور کس حال میں ہے۔

(ماہر القادری، الحسنات، رام پور)

(۳۹) ''اگر حضور عالم الغیب ہوتے تو حدیبیہ میں حضرت عثمان کی شہادت کی افواہ سنتے ہی فرما دیتے کہ یہ خبر غلط ہے۔ عثمان مکہ میں زندہ ہیں۔ صحابۂ کرام کی اتنی بڑی جماعت تک کو اصل واقعہ کا کشف نہیں ہوا۔''

(ماہر القادری، فاران کا توحید نمبر، ص: ۱۳۰)

★★★-------------★★★-------------★★★

۱۱

تصویر کا دوسرا رُخ

اگر کسی طرح کی بدگمانی کو راہ نہ دی جائے تو تصویر کے پہلے رُخ میں مسئلہ علمِ غیب اور قدرت وتصرف پر دیوبندی علما کی جو عبارتیں نقل کی گئی ہیں اُنھیں پڑھنے کے بعد ایک خالی الذہن آدمی قطعاً یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہے گا کہ رسول مجتبیٰ ﷺ اور دیگر انبیا و اولیا کے حق میں علمِ غیب اور قدرت وتصرف کا عقیدہ یقیناً توحید کے منافی اور کھلا ہوا کفر وشرک ہے اور لازماً اُسے علمائے دیوبند کے ساتھ یہ خوش عقیدگی ہوگی کہ وہ مذہب توحید کے سچے علمبردار اور کفر وشرک کے معتقدات کے خلاف وقت کے سب سے بڑے مجاہد ہیں۔

لیکن آہ! میں کن لفظوں میں اس سربستہ راز کو بے نقاب کروں کہ اس خاموش سطح کے نیچے ایک نہایت خوفناک طوفان چھپا ہوا ہے۔ تصویر کے اس رُخ کی دلکشی اسی وقت تک باقی ہے جب تک کہ دوسرا رُخ نگاہوں سے اوجھل ہے۔ یقین کرتا ہوں کہ پردہ اُٹھ جانے کے بعد توحید پرستی کی ساری گرم جوشیوں کا ایک آن میں بھرم کُھل جائے گا۔

قبل اس کے کہ میں اصل حقیقت کے چہرے سے نقاب اُٹھاؤں آپ کے دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ کر ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔

فرض کیجیے! اگر آپ کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ علم غیب سے لے کر تصرف واختیار تک، جن جن باتوں کے اعتقاد کو دیوبندی جماعت کے ان پیشواؤں نے رسول مجتبیٰ ﷺ اور دیگر انبیا و اولیا کے حق میں کفر وشرک اور منافی توحید قرار دیا ہے، ان ہی ساری باتوں کو وہ اپنے گھر کے بزرگوں کے حق میں جائز بلکہ واقع تسلیم کرتے ہیں تو آپ کے ذہنی واردات کی کیا کیفیت ہوگی؟

کیا اس صورت حال کو آپ مذہبی تاریخ کا سب سے بڑا فریب نہیں قرار دیں گے اور اس سنسنی خیز انکشاف کے بعد آپ کے ذہن کی سطح پر جو تصویر ابھرے گی کیا وہ رہ گزر کے ان ٹھگوں سے کچھ مختلف ہوگی جو آنکھوں میں دھول جھونک کر مسافروں کو لوٹ لیا کرتے ہیں۔

اگر حالات کا یہ ردِّ عمل فطرت کے عین مطابق ہے تو سن لیجیے کہ جو صورتِ حال آپ نے فرض کی تھی وہ مفروضہ نہیں بلکہ امر واقعہ ہے۔ ہمارے اس پیشِ لفظ پر اعتماد نہ کرسکیں تو ذہنی طور پر ایک حیرت انگیز تبدیلی کے لیے تیار ہو کر ورق اُلٹیے اور دیوبندی جماعت کے پیشواؤں کے وہ واقعات پڑھیے جن میں عقیدۂ توحید اور اسلام و ایمان کی سلامتی کے سوا سب کچھ ہے۔

غیب دانی کا اعتقاد، دلوں کے خطرات پر اطلاع، سیکڑوں میل کی مسافت سے مخفیات کا علم، ماں کے پیٹ میں کیا ہے؟، بارش کب ہوگی؟ کل آئندہ کیا پیش آئے گا؟، کون کب مرے گا؟، کس کی وفات کہاں ہوگی؟، دیوار کے پیچھے کیا ہے؟، اپنے ارادہ و تصرف سے مارنا، شفا بخشنا، بارش روک دینا، بارش برسا دینا، امداد و دستگیری کے لیے آنِ واحد میں اپنی اپنی قبروں سے نکل کر دور دور پہنچ جانا، تصوّر کرتے ہی سامنے موجود ہو جانا، سارے جہاں کا ایک نظر میں احاطہ کر لینا، مصیبت کے وقت غائب کو اپنی مدد کے لیے پکارنا، گذشتہ اور آئندہ کی خبریں دینا، یہ سمجھنا کہ ہر وقت ہمارے دل کے احوال کی خبر رکھتے ہیں، یہ سمجھنا کہ تصور کرتے ہی باخبر ہو جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ وہی ساری باتیں ہیں جنہیں علمائے دیوبند کی مذکورۃ الصدر کتابوں میں صرف خدا کا حق تسلیم کیا گیا ہے اور غیرِ خدا یہاں تک کہ رسولِ مجتبیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حق میں بھی اس طرح کے اعتقادات کو کفر و شرک قرار دیا گیا ہے۔

لیکن کمال حیرت کے ساتھ یہ خبرِ وحشت اثر سنیے کہ یہی خدائی کا منصب، یہی کھلا ہوا کفر و شرک اور یہی توحید کے منافی اعتقادات علمائے دیوبند نے اپنے گھر کے بزرگوں کے حق میں بے چوں و چرا تسلیم کر لیے ہیں۔

یہ کتاب چھ (۶) ابواب پر مشتمل ہے اور الگ الگ ہر باب میں دیوبندی جماعت کے بزرگوں کے وہ واقعات و حالات جمع کیے گئے ہیں جنھیں پڑھنے کے بعد آپ کے دماغ کا تار جھنجھنا اُٹھے گا اور ان حضرات کی توحید پرستی کا سارا بھرم کھل جائے گا۔

ہم نہ کہتے تھے کہ اے داغؔ تو زلفوں کو نہ چھیڑ
اب وہ برہم ہے تو ہے تجھ کو قلق یا ہم کو

★★★-------------★★★-------------★★★

پہلا باب

بانی دار العلوم دیوبند جناب
مولوی محمّد قاسم صاحب نانوتوی
کے بیان میں

اس باب میں دیوبندی لٹریچر سے مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی سے متعلق وہ واقعات و حالات جمع کیے گئے ہیں جن میں عقیدۂ توحید سے تصادم، اپنے مذہب سے انحراف اور اپنے گھر کے بزرگوں کے حق میں منہ بولے کفر و شرک کو اسلام و ایمان بنا لینے کے حیرت انگیز نمونے ورق ورق پر بکھرے ہوئے ہیں۔ انھیں پڑھیے اور مذہبی تاریخ میں پہلی بار ایک عجیب طلسم فریب کا تماشا دیکھیے۔

سلسلۂ واقعات

(۱)

وفات کے بعد مولوی قاسم نانوتوی کا جسمِ ظاہری کے ساتھ مدرسۂ دیوبند میں آنا:

قاری طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند بیان کرتے ہیں کہ جس زمانے میں مولوی رفیع الدین صاحب مدرسہ کے مہتمم تھے، دارالعلوم کے بعض مدرسین کے درمیان آپس میں کچھ نزاع چھڑ گئی۔ آگے چل کر مدرسہ کے صدر مدرس مولوی محمودالحسن صاحب بھی اس ہنگامے میں شریک ہوگئے اور جھگڑا طول پکڑ گیا۔ اب اس کے بعد کا واقعہ قاری طیب صاحب ہی کی زبانی سُنیے۔ موصوف لکھتے ہیں کہ:

"اسی دوران میں ایک دن علی الصبح بعد نماز فجر مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا محمودالحسن صاحب کو اپنے حجرہ میں بلایا (جو دارالعلوم دیوبند میں ہے) مولانا حاضر ہوئے اور بند حجرہ کے کواڑ کھول کر اندر داخل ہوئے موسم سخت سردی کا تھا۔

مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ پہلے یہ میرا روئی کا لبادہ دیکھ لو۔ مولانا نے لبادہ دیکھا تو تر تھا اور خوب بھیگ رہا تھا۔ فرمایا کہ واقعہ یہ ہے

کہ ابھی ابھی مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جسدِ عنصری (جسمِ ظاہری) کے ساتھ میرے پاس تشریف لائے تھے جس سے میں ایک دم پسینہ پسینہ ہوگیا اور میرا لبادہ تر بتر ہوگیا۔ اور یہ فرمایا کہ محمود حسن کو کہہ دو کہ وہ اس جھگڑے میں نہ پڑے۔ بس میں نے یہ کہنے کے لیے بلایا ہے۔ مولانا محمود حسن صاحب نے عرض کیا کہ حضرت میں آپ کے ہاتھ پر توبہ کرتا ہوں کہ اس کے بعد میں اس قصّے میں کچھ نہ بولوں گا۔"

(ارواحِ ثلٰثہ، ص:۲۴۲)

مولوی نانوتوی صاحب کا خدائی تصرف:

اب ایک نیا تماشہ اور ملاحظہ فرمایئے قاری صاحب کی اس روایت پر دیوبندی مذہب کے پیشوا مولوی اشرف علی صاحب تھانوی نے اپنا ایک نیا حاشیہ چڑھایا ہے۔ جس میں بیان کردہ واقعے کی توثیق کرتے ہوئے موصوف نے تحریر کیا ہے:

"یہ واقعہ روح کا تمثل تھا۔ اور اس کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں ایک یہ کہ جسدِ مثالی تھا مگر مشابہ جسدِ عنصری کے، دوسری صورت یہ کہ روح نے خود عناصر میں تصرف کرکے جسدِ عنصری تیار کرلیا ہو۔"

(ارواحِ ثلاثہ، ص:۲۴۳)

لاالٰہ الااللہ! دیکھ رہے ہیں آپ؟ اس ایک واقعے کے ساتھ کتنے مشرکانہ عقیدے لپٹے ہوئے ہیں۔ پہلا عقیدہ تو مولوی قاسم صاحب نانوتوی کے حق میں علمِ غیب کا ہے۔ کیوں کہ ان حضرات کے تئیں اگر انھیں علمِ غیب نہیں تھا تو عالمِ برزخ میں انھیں کیوں کر خبر ہوگئی کہ مدرسۂ دیوبند میں مدرسین کے درمیان سخت ہنگامہ ہوگیا ہے یہاں تک کہ مدرسہ کے صدر مدرس مولوی محمودالحسن صاحب بھی اس میں شامل ہوگئے ہیں چل کر انھیں منع کردیا جائے۔

اور پھر ان کی روح کی قوت تصرف کا کیا کہنا کہ تھانوی صاحب کے ارشاد کے مطابق اس جہان خاکی میں دوبارہ آنے کے لیے اس نے خود ہی آگ، پانی اور ہوا، مٹی کا ایک انسانی جسم تیار کیا اور خود ہی اس میں داخل ہو کر زندگی کے آثار اور نقل و حرکت کی قوتِ ارادی سے مسلح ہوئی اور لحد سے نکل کر سیدھے دیوبند کے مدرسہ میں چلی آئی۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ مولوی قاسم صاحب نانوتوی کی روح کے لیے یہ "خدائی اختیارات" بلا چون و چرا مولوی رفیع الدین صاحب نے بھی تسلیم کر لیا مولوی محمود الحسن صاحب بھی اس پر آنکھ بند کر کے ایمان لے آئے۔ اور تھانوی صاحب کا کیا کہنا کہ انھوں نے تو جسمِ انسانی کا خالق ہی اُسے ٹھہرا دیا۔ اور اب قاری طیّب صاحب اس کی تشہیر فرما رہے ہیں۔

ان حالات میں ایک صحیح الدماغ آدمی یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ روح کے جو تصرفات و اختیارات اور غیبی علم و ادراک کی جو قوتیں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے مقربین کے حق میں تسلیم کرنا یہ حضرات کفر و شرک سمجھتے ہیں وہی "اپنے مولانا" کے حق میں کیونکر اسلام و ایمان بن گیا ہے؟

کیا یہ صورتِ حال اس حقیقت کو واضح نہیں کرتی کہ ان حضرات کے یہاں کفر و شرک کی یہ تمام بحثیں اس لیے ہیں کہ انبیا و اولیا کی حرمتوں کے خلاف جنگ کرنے کے لیے اُنھیں ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جائے۔ ورنہ خالص عقیدۂ توحید کا جذبہ اس کے پس منظر میں کار فرما ہوتا تو شرک کے سوال پر اپنے اور بیگانے کے درمیان قطعاً کوئی تفریق روا نہ رکھی جاتی۔

(۲)

ایک اور حیرت انگیز واقعہ:

دیوبندی جماعت کے مشہور فاضل مولوی مناظر احسن گیلانی نے سوانح قاسمی کے نام سے مولوی قاسم صاحب نانوتوی کی ایک ضخیم سوانح حیات لکھی ہے۔ جسے دار العلوم دیوبند نے خود

اپنے اہتمام سے شائع کیا ہے۔

اپنی اس کتاب میں مولوی محمود الحسن صاحب کے حوالے سے اُنھوں [1] نے کسی "واعظ مولانا" کے ساتھ ایک دیوبندی طالب علم کا ایک بڑا ہی عجیب و غریب مناظرہ نقل کیا ہے۔ اُس دیوبندی طالب علم کے متعلق موصوف کے بیان کا یہ حصّہ خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہے۔ لکھتے ہیں:

"وہ پنجاب کی طرف کسی علاقہ میں چلا گیا اور کسی قصبہ کی مسجد میں لوگوں نے ان کو امام کی جگہ دے دی۔ قصبہ والے ان سے کافی مانوس ہو گئے اور اچھی گذر بسر ہونے لگی۔ اسی عرصے میں کوئی مولوی صاحب گشت کرتے ہوئے اُس قصبے میں بھی آ دھمکے۔ وعظ و تقریر کا سلسلہ شروع کیا۔ لوگ ان کے کچھ معتقد ہوئے اُنھوں نے دریافت کیا کہ یہاں کی مسجد کا امام کون ہے؟ کہا گیا کہ دیوبند کے پڑھے ہوئے ایک مولوی صاحب ہیں۔

دیوبند کا نام سننا تھا کہ واعظ مولانا صاحب آگ بگولہ ہو گئے اور فتویٰ دے دیا کہ اس عرصے میں جتنی نمازیں اس دیوبندی کے پیچھے تم لوگوں نے پڑھی ہیں وہ سرے سے ادا ہی نہیں ہوئیں اور جیسا کہ دستور ہے، دیوبندی یہ ہیں، وہ ہیں، یہ کہتے ہیں، وہ کہتے ہیں، اسلام کے دشمن ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت رکھتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

قصباتی مسلمان بے چارے سخت حیران ہوئے کہ مفت میں اس مولوی پر روپے بھی برباد ہوئے اور نمازیں بھی برباد ہوئیں ایک وفد اس غریب دیوبندی امام کے پاس پہنچا اور مستدعی ہوا کہ مولانا واعظ صاحب جو ہمارے قصبے میں آئے ہیں اُن کے جو الزامات ہیں یا تو ان کا جواب دیجیے ورنہ پھر بتائیے کہ ہم لوگ آپ کے ساتھ کیا کریں۔ جان بھی غریب کی خطرے میں آ گئی اور نوکری و وکری کا قصّہ تو ختم شدہ ہی معلوم ہونے لگا۔ چوں کہ علمی مواد بھی ان کا معمولی تھا خوف زدہ ہوئے کہ خدا جانے یہ واعظ مولانا صاحب کس پائے کے عالم ہیں؟

منطق وفلسفہ بگھاریں گے اور میں غریب اپنا سیدھا سادہ ملّا ہوں ان سے بازی لے بھی جا سکتا ہوں یا نہیں؟ تاہم چارۂ کار اس کے سوا اور کیا تھا کہ مناظرہ کا وعدہ ڈرتے ڈرتے کرلیا۔ تاریخ ومحل ومقام سب کا مسئلہ طے ہوگیا۔ واعظ مولانا صاحب بڑا زبردست عمامہ طویلہ وعریضہ سر پر لپیٹے ہوئے کتابوں کے پشتارے کے ساتھ مجلس میں اپنے حواریوں کے ساتھ جلوہ فرما ہوئے۔ ادھر یہ غریب دیوبندی امام، منحنی وضعیف، مسکین شکل، مسکین آواز، خوفزدہ لرزاں وترساں بھی اللہ اللہ کرتے ہوئے سامنے آیا۔

سُننے کی بات یہی ہے جو اس کے بعد اس دیوبندی امام مولوی نے مشاہدہ کے بعد بیان کی، کہتے تھے کہ مولانا واعظ صاحب کے سامنے میں بھی بیٹھ گیا۔ ابھی گفتگو شروع نہیں ہوئی تھی کہ اچانک اپنے بازو میں مجھے محسوس ہوا کہ ایک شخص اور جسے میں نہیں پہچانتا تھا وہ بھی آکر بیٹھ گیا اور مجھ سے وہ اجنبی اچانک نمودار ہونے والی شخصیت کہتی ہے کہ ہاں! گفتگو شروع کرو اور ہرگز نہ ڈرو، دل میں غیر معمولی قوت اس سے پیدا ہوئی۔

اس کے بعد کیا ہوا؟ دیوبندی امام صاحب کا بیان ہے کہ میری زبان سے کچھ فقرے نکل رہے تھے اور اس طور پر نکل رہے تھے کہ میں خود نہیں جانتا تھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ جس کا جواب مولانا واعظ صاحب نے ابتدا میں تو دیا لیکن سوال وجواب کا سلسلہ ابھی زیادہ دراز بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک دفعہ مولانا واعظ صاحب کو دیکھتا ہوں کہ اُٹھ کھڑے ہوئے میرے قدموں پر سر ڈالے رو رہے ہیں۔ پگڑی بکھری ہوئی ہے اور کہتے جاتے ہیں میں نہیں جانتا تھا کہ آپ اتنے بڑے عالم ہیں، اللہ معاف کیجیے! آپ جو کچھ فرما رہے ہیں یہی صحیح اور درست ہے میں ہی غلطی پر تھا۔

''یہ منظر ہی ایسا تھا کہ مجمع دم بخود تھا کیا سوچ کر آیا تھا اور کیا دیکھ رہا تھا۔ دیوبندی امام صاحب نے کہا کہ اچانک نمودار ہونے والی شخصیت میری نظر سے

اس کے بعد اوجھل ہوگئی اور کچھ نہیں معلوم کہ وہ کون تھے اور یہ قصہ کیا تھا؟''

(سوانح قاسمی، ج:۱، ص:۳۳۰،۳۳۱)

یہاں تک اصل قصہ بیان کرچکنے کے بعد اب مولوی مناظر احسن گیلانی ایک نہایت پر اسرار اور حیرت انگیز واقعہ کی نقاب کشائی فرماتے ہیں، دراصل ان کے بیان کا یہی حصّہ ہماری بحث کا مرکزی نقطہ ہے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں:

''حضرت شیخ الہند (یعنی مولوی محمود الحسن صاحب) فرماتے تھے میں نے ان مولوی صاحب سے دریافت کیا کہ اچانک نمودار ہوکر غائب ہوجانے والی شخصیت کا حُلیہ کیا تھا؟ حلیہ جو بیان کیا، فرماتے تھے کہ سنتا جاتا تھا اور حضرت الاستاذ (یعنی مولوی قاسم نانوتوی) کا ایک ایک خال وخط نظر کے سامنے آتا چلا جا رہا تھا۔ جب وہ بیان ختم کرچکے تو میں نے ان سے کہا کہ یہ تو حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ تھے جو تمہاری امداد کے لیے حق تعالیٰ کی طرف سے ظاہر ہوئے۔''

(سوانح قاسمی، ج:۱، ص:۲۳۲)

ملاحظہ فرمایئے! قصہ آرائی سے قطع نظر اس ایک واقعے کے اندر مولوی قاسم صاحب نانوتوی کے حق میں کتنے مشرکانہ عقائد کا برملا اعتراف کرلیا گیا ہے۔

اولاً یہ کہ نہایت فراخدلی کے ساتھ اُن کے اندر غیب دانی کی وہ قوت بھی مان لی گئی ہے جس کے ذریعے انہیں عالمِ برزخ ہی میں معلوم ہوگیا کہ ایک دیوبندی امام فلاں مقام پر میدانِ مناظرہ میں یکہ وتنہا بے بسی کی حالت میں دم توڑ رہا ہے، چل کر اس کی مدد کی جائے۔

دوسرے یہ کہ ان کے حق میں یہ قوت تصرف بھی تسلیم کرلی گئی ہے کہ وہ اپنے ظاہری جسم کے ساتھ اپنی لحد سے نکل کر جہاں چاہیں بے روک ٹوک جاسکتے ہیں۔

تیسرے یہ کہ مرنے کے بعد زندوں کی مدد کرنے کا اختیار چاہے دیوبندی حضرات کے تئیں انبیا واولیا کے لیے بھی ثابت نہ ہو، لیکن ''اپنے مولانا'' کے لیے ضرور ثابت ہے۔

اب آپ ہی انصاف کیجیے کہ یہ صورت حال کیا اس یقین کو تقویت نہیں پہنچاتی کہ ان حضرات کے یہاں کفر وشرک کی یہ تمام بحثیں صرف اس لیے ہیں کہ انہیں انبیاء واولیاء کی حرمتوں

کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جائے۔ ورنہ خاص عقیدۂ توحید کا جذبہ اس کے پسِ منظر میں کارفرما ہوتا تو شرک کے سوال پر اپنے اور بے گانے کی تفریق کیوں روا رکھی جاتی؟

اپنے ہی ہاتھوں اپنے مذہب کا خون:

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ بیان کر چکنے کے بعد مولوی مناظر احسن گیلانی کو اچانک یاد آیا کہ ہمارے یہاں تو ارواحِ انبیا تک کے لیے بھی زندوں کی مدد کرنے کا کوئی تصور نہیں ہے بلکہ اپنے مشرب میں ہم اس طرح کے تصورات کو ''مشرکانہ عقائد'' سے تعبیر کرتے آرہے ہیں پھر اتنے واضح اور مسلسل اور متوارث انکار کے بعد اپنے مولانا کے ذریعے غیبی امداد کا یہ قصہ کیوں کر نباہا جا سکے گا؟

یہ سوچ کر بجائے اس کے کہ اپنے مسلک کو بچانے کے لیے موصوف اس مصنوعی قصے کا انکار کرتے، اُنھوں نے اپنے مولانا کا ''خدائی اختیار'' ثابت کرنے کے لیے اپنے اصل مذہب ہی کا انکار کر دیا۔

میں یقین کرتا ہوں کہ مذہبی انحراف کی ایسی شرمناک مثال کسی فرقے کی تاریخ میں شاید ہی مل سکے گی۔ واقعہ بیان کر چکنے کے بعد کتاب کے حاشیے میں موصوف ارشاد فرماتے ہیں۔ ''حیرت میں ڈوب کر یہ اَن کہی'' پڑھیے اور علم و دیانت کا ایک تازہ خون اور ملاحظہ فرمایئے۔ لکھتے ہیں:

> وفات یافتہ بزرگوں کی روحوں سے امداد کے مسئلہ میں علمائے دیوبند کا خیال بھی وہی ہے جو عام اہلسنّت والجماعت کا ہے۔ آخر جب ملائکہ جیسی روحانی ہستیوں سے خود قرآن ہی میں ہے کہ حق تعالیٰ اپنے بندوں کی امداد کراتے ہیں۔
>
> صحیح حدیثوں میں ہے کہ واقعہ معراج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تخفیفِ صلوٰۃ کے مسئلہ میں امداد ملی اور دوسرے انبیا علیہم السلام سے ملاقاتیں ہوئیں، بشارتیں ملیں تو اسی قسم کی ارواحِ طیبہ سے کسی مصیبت زدہ مومن کی امداد کا کام قدرت اگر لے تو قرآن کی کس آیت یا کس حدیث سے اسکی

تردید ہوتی ہے؟''

(حاشیہ سوانح قاسمی، ج:۱، ص ۳۳۲)

سبحان اللہ! ذرا غلبۂ حق کی شان تو دیکھیے کہ وفات یافتہ بزرگوں کی روحوں سے امداد کے مسئلے میں کل تک جو سوال ہم اُن سے کرتے تھے آج وہی سوال وہ اپنے آپ سے کر رہے ہیں۔ اب اس سوال کا جواب تو اُنھی لوگوں کے ذمہ ہے جنھوں نے ایک خالص اسلامی عقیدے کو کفر و شرک کا نام دے کر اصل حقیقت کا چہرہ مسخ کیا ہے اور جس کے کئی صفحات پر پھیلے ہوئے نمونے آپ ''تصویر کے پہلے رُخ'' میں پڑھ آئے ہیں۔

تاہم گیلانی صاحب کے اس حاشیے سے اتنی بات ضرور صاف ہو گئی کہ جو لوگ وفات یافتہ بزرگوں کی روحوں سے امداد کے قائل ہیں وہی فی الحقیقۃ اہلسنّت و جماعت ہیں۔ اب اُنھیں بدعتی کہہ کر پکارنا نہ صرف یہ کہ اپنے آپ کو جھٹلانا ہے، بلکہ اخلاقی رذائل سے اپنی زبان اور قلم کی آلودگی کا مظاہرہ بھی کرنا ہے۔

حاشیے کی عبارت کا یہ حصہ بھی دیدۂ حیرت سے پڑھنے کے قابل ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں:

> ''اور سچ تو یہ ہے کہ آدمی کو عام طور پر جو امداد بھی مل رہی ہے حق تعالیٰ اپنی مخلوقات ہی سے تو یہ امدادیں پہنچا رہے ہیں روشنی آفتاب سے ملتی ہے، دودھ ہمیں گائے اور بھینس سے ملتا ہے۔ یہ تو ایک واقعہ ہے بھلا یہ بھی انکار کرنے کی کوئی چیز ہو سکتی ہے؟''

(حاشیہ سوانح قاسمی، ج:۱، ص:۳۳۲)

انکار کی بات کیا پوچھتے ہیں کہ آپ کے یہاں تو اس ایک مورچے پر نصف صدی سے جنگ لڑی جا رہی ہے، معرکۂ کارزار میں حقائق کی تڑپتی ہوئی لاشیں آپ نہیں دیکھ پاتے تو اپنے ہی قلم کی تلوار سے لہو کی ٹپکتی ہوئی بوند ملاحظہ فرما لیجیے۔

حاشیے کی عبارت جس حصے پر تمام ہوئی ہے اس میں اعترافِ حق کا مطالبہ اس قدر بے قابو ہو گیا ہے کہ تحریر کے نقوش سے آواز آرہی ہے۔ اہلِ حق کو بغیر کسی لشکر کشی کے اپنے مسلک کی

یہ فتح مبین مبارک ہو! ارشاد فرماتے ہیں:

''پس بزرگوں کی ارواح سے مدد لینے کے ہم منکر نہیں ہیں۔''

(حاشیہ سوانح قاسمی، ج:۱، ص:۳۳۳)

اللہ اکبر! دیکھ رہے ہیں آپ؟ قصہ آرائی کو واقعہ بنانے کے لیے یہاں کتنی بے دردی کے ساتھ مولانا نے اپنے مذہب کا خون کیا ہے۔ جو عقیدہ نصف صدی سے پوری جماعت کے ایوانِ فکر کا سنگِ بنیاد رہا ہے اُسے ڈھادینے میں موصوف کو ذرا بھی تامل نہیں ہوا۔

اعتقاد وعمل کے درمیان شرمناک تصادم:

سر بہ گریباں ہوکر علم و دیانت کی پامالی کا ذرا یہ تماشا ملاحظہ فرمایئے کہ سوانح قاسمی نامی کتاب خاص دارالعلوم دیوبند کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے، قاری طیب صاحب مہتمم بذات خود اس کے پبلشر ہیں۔ اپنے حلقۂ اثر میں کتاب کی ثقاہت کسی رُخ سے بھی مشکوک نہیں کہی جاسکتی۔ لیکن سخت حیرت ہے کہ نانوتوی صاحب کو مافوق البشر ثابت کرنے کے لیے دیوبندی جماعت کے ان مشاہیر نے ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت کا انکار کیا ہے جسے اب وہ چھپانا بھی چاہیں تو نہیں چھپا سکتے۔

مثال کے طور پر وفات یافتہ بزرگوں کی روحوں سے امداد کے مسئلے میں دیوبندی حضرات کا اصل مذہب کیا ہے اسے معلوم کرنے کے لیے دیوبندی مذہب کی بنیادی کتاب ''تقویۃ الایمان'' کی یہ عبارت پڑھیے:

''مُرادیں پوری کرنی، حاجتیں بر لانی، بلائیں ٹالنی، مشکل میں دستگیری کرنی، بُرے وقت میں پہنچنا، یہ سب اللہ ہی کی شان ہے اور کسی انبیاء و اولیاء کی، پیر و شہید کی، بھوت و پری کی یہ شان نہیں، جو کسی کو ایسا ثابت کرے اور اس سے مرادیں مانگے اور اس توقع پر نذر و نیاز کرے اور اس کی منتیں مانے اور مصیبت

کے وقت اس کو پکارے سو وہ مشرک ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔ پھر خواہ یوں سمجھے کہ ان کاموں کی طاقت ان کو خود بخود ہے، خواہ یوں سمجھے کہ اللہ نے ان کو الٰہی قدرت بخشی ہے ہر طرح شرک ثابت ہوتا ہے۔''

(تقویۃ الایمان، ص:۱۰، آرمی پریس دہلی)

یہ ہے عقیدہ کہ مُردہ و زندہ، نبی اور ولی کسی کے اندر بھی مُرادیں پوری کرنے، حاجت بر لانے، بلا ٹالنے، مشکل میں دستگیری کرنے اور بُرے وقت میں پہنچنے کی کوئی طاقت و قدرت نہیں ہے نہ ذاتی نہ عطائی۔

اور وہ ہے عمل کہ نانوتوی صاحب وفات کے بعد حاجت بھی بر لائے، بلا بھی ٹال دی اور بُرے وقت میں اس شان سے پہنچے کہ سارے جہاں میں ڈنکا بج گیا۔

ایک ہی بات جو ہر جگہ شرک تھی، سب کے لیے شرک تھی، ہر حال میں شرک تھی، جب ''اپنے مولانا'' کی بات آ گئی تو اچانک اسلام بن گئی اور امر واقعہ بن گئی۔

اور پھر دلوں کا ایک ہی عقیدہ جب تک اس کا تعلق نبی اور ولی سے تھا تو سارا قرآن اس کے خلاف، ساری احادیث اس سے مزاحم اور سارا اسلام اس کی بیخ کنی میں تسلیم کر لیا گیا۔ لیکن صرف تعلق بدل گیا اور نبی و رسول کی جگہ ''اپنے مولانا'' کی بات آ گئی تو آپ دیکھ رہے ہیں کہ اب سارا قرآن اس کی حمایت میں، ساری احادیث اس کی تائید میں اور سارا اسلام اس کی پشت پناہی میں ہے۔

ع: آواز دو انصاف کو انصاف کہاں ہے؟

اپنی تکذیب کی ایک شرمناک مثال:

بات درمیان میں آ گئی ہے تو وفات یافتہ بزرگوں کی روحوں سے امداد کے مسئلے میں دیوبندی جماعت کے مشہور مناظر مولوی منظور صاحب نعمانی کا ایک اداریہ پڑھیے جسے انھوں نے

'ماہنامہ الفرقان لکھنؤ' میں سپردِ قلم کیا ہے تاکہ اس مسئلے میں دیوبندی جماعت کا اصل ذہن آپ پر واضح ہوجائے۔ موصوف لکھتے ہیں:

''جن بندوں کو اللہ نے کوئی ایسی قابلیت دے دی ہے جس سے دوسروں کو بھی کوئی نفع یا امداد پہنچا سکتے ہیں۔ جیسے حکیم، ڈاکٹر، وکیل وغیرہ، تو ان کے متعلق ہر ایک یہ سمجھتا ہے کہ ان میں کوئی غیبی طاقت نہیں اور ان کے اپنے قبضے میں کچھ بھی نہیں ہے اور یہ بھی ہماری ہی طرح اللہ کے محتاج بندے ہیں۔ بس اتنی سی بات ہے کہ اللہ نے انھیں اس عالمِ اسباب میں اس قابل بنادیا ہے کہ ہم ان سے فلاں کام میں مدد لے سکتے ہیں۔

اس بنا پر ان سے کام لینے اور اعانت حاصل کرنے میں شرک کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا ہے شرک جب ہوتا ہے جب کسی ہستی کو اللہ کے قائم کیے ہوئے اس ظاہری سلسلۂ اسباب سے الگ غیبی طور پر اپنے ارادۂ واختیار سے کار فرما اور متصرف سمجھا جائے اور اس اعتقاد کی بنا پر اس سے اپنی حاجتوں میں مدد مانگی جائے۔

(الفرقان: جمادی الاولیٰ ۱۳۷۲ھ، ص:۲۵)

واضح رہے کہ دارالعلوم دیوبند کے ''واقعہ نزاع'' اور ''قصۂ مناظرہ'' میں نانوتوی صاحب کے متعلق جو روایتیں نقل کی گئی ہیں، ان تمام واقعات میں ظاہری سلسلۂ اسباب سے الگ غیبی طور پر ہی ان کی امداد وتصرف کا عقیدہ ظاہر کیا گیا ہے۔ اب تو اس کے شرک ہونے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رہ جاتا۔

اداریہ کی عبارت جس حصے پر تمام ہوئی ہے وہ بھی خاصی توجہ سے پڑھنے کے قابل ہے۔ قلم کی نوک سے روشنائی کی جگہ زہر ٹپک رہا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:

''آپ مسلمان کہلانے والے قبوریوں اور تعزیہ پرستوں کو دیکھ لیجیے۔ شیطان نے ان مشرکانہ اعمال کو ان کے دلوں میں ایسا اُتار دیا ہے کہ وہ اس سلسلے میں قرآن وحدیث کی کوئی بات سننے کے روادار نہیں۔

میں تو انھیں لوگوں کو دیکھ کر اگلی امتوں کے شرک کو سمجھتا ہوں اگر مسلمانوں میں یہ لوگ نہ ہوتے تو واقعہ یہ ہے کہ میرے لیے اگلی امتوں کے شرک[1] کو سمجھنا بڑا مشکل ہوتا''

(الفرقان، ص:۳۰)

توحید پرستی کا ذرا یہ غرّہ ملاحظہ فرمائیے کہ موصوف کو مسلمانوں کا چھپا ہوا شرک تو نظر آگیا لیکن اپنے گھر کا ''عریاں شرک'' نظر نہیں آتا۔ کتنی معصومیت کے ساتھ آپ فرمارہے ہیں کہ ''اگر مسلمانوں میں یہ لوگ نہ ہوتے تو میرے لیے اگلی امتوں کے شرک کو سمجھنا مشکل ہوتا۔'' میں کہتا ہوں مشکل کیوں ہوتا؟ شرک کو سمجھنے کے لیے گھر ہی میں کس بات کی کمی تھی خدا کا دیا سب کچھ تھا۔

سچ پوچھیے تو اسی طرح کی خود فریبیوں کا جادو توڑنے کے لیے میرے ذہن میں زیرِ نظر کتاب کی ترتیب کا خیال پیدا ہوا کہ اصحابِ عقل وانصاف واضح طور پر محسوس کرلیں کہ جو لوگ دوسروں پر شرک کا الزام عائد کرتے ہیں اپنے نامۂ اعمال کے آئینے میں وہ خود کتنے بڑے مشرک ہیں؟

ایک اور عبرت ناک کہانی:

بحث کے خاتمے پر اس سلسلے کی ایک عبرت ناک کہانی اور سن لیجیے تاکہ حُسنِ ظن کی حجت بھی تمام ہوجائے۔

ہندوستان کے اندر وفات یافتہ بزرگوں میں سلطان الاولیا، حضرت خواجہ غریب نواز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عظمتِ خداداد اور ان کی روحانیت کا فیضانِ عام آٹھ سو برس کی تاریخ کا ایک جانا پہچانا واقعہ ہے۔ لیکن جذبۂ دل کی ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیے کہ دیوبندی جماعت کے مذہبی پیشوا مولوی اشرف علی تھانوی صاحب نے سرکار خواجہ کے سنگِ در کا رشتہ بُت خانے کی دہلیز کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ جیسا کہ تھانوی صاحب کے ملفوظات کا مرتب ان کی مجلس کا حال بیان کرتے ہوئے

خودان کا یہ منہ بولا بیان نقل کرتا ہے:

''ایک انگریز نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں سب سے زیادہ حیرت انگیز بات میں نے دیکھی کہ اجمیر میں ایک مُردہ کو دیکھا کہ اجمیر میں پڑا ہوا سارے ہندوستان پر سلطنت کر رہا ہے۔''

(کمالاتِ اشرفیہ، ص:۲۵۲)

انگریز کا یہ قول نقل کرنے کے بعد تھانوی صاحب نے ارشاد فرمایا:

''واقعی خواجہ صاحب کے ساتھ لوگوں کو بالخصوص ریاست کے امرا کو بہت ہی عقیدت ہے (اس پر) خواجہ عزیز الحسن نے عرض کیا کہ جب فائدہ ہوتا ہوگا تبھی تو عقیدت ہے۔ (تھانوی صاحب نے) فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ جیسا حُسنِ ظن ہو ویسا ہی معاملہ فرماتے ہیں۔ اس طرح تو بت پرستوں کو بت پرستی میں بھی فائدہ ہوتا ہے، یہ کوئی دلیل تھوڑا ہی ہے۔ دلیل ہے شریعت۔''

(کمالاتِ اشرفیہ، ص:۲۵۲)

بت پرستی کے فوائد کی تفصیل تو تھانوی صاحب ہی بتا سکتے ہیں کہ سب سے پہلے وہی اس تجربے سے فیضیاب ہوئے۔ لیکن غیرت سے ڈوب مرنے کی بات تو یہ ہے کہ ایک ''منکر اسلام دشمن'' اور ''ایک کلمہ گو دوست'' کی نگاہوں کا فرق ذرا ملاحظہ فرمایئے دشمن کی نظر میں سرکار خواجہ کشورِ ہند کے سلطان کی طرح جگمگا رہے ہیں جب کہ دوست کی نگاہ انھیں پتھر کے صنم سے بھی زیادہ حیثیت نہیں دیتی۔

اس مقام پر مجھے صرف اتنی بات کہنی ہے کہ ایمان کی آنکھوں کا چراغ اگر گل نہیں ہو گیا ہے تو ایک طرف ان دیوبندی مشاہیر کے ذہن میں نانوتوی صاحب کا وہ سراپا دیکھیے کتنا بااختیار اور کبریائی قدرتوں سے کتنا مسلح نظر آتا ہے کہ کارسازی اور چارہ گری کے لیے وہ نیازمندوں کو اپنے مرقد تک بھی آنے کی زحمت نہیں دیتے۔

جہاں ذرا سی آنچ محسوس ہوئی خود ہی عالمِ برزخ سے دوڑے چلے آتے ہیں اور اپنی

کارسازی کا جلوہ دکھا کر واپس لوٹ جاتے ہیں اور آتے بھی ہیں تو اپنے اسی پیکرِ مانوس میں کہ دیکھنے والے انھیں ماتھے کی آنکھوں سے دیکھیں اور پہچان لیں۔

لیکن وائے رے دلِ حرماں نصیب کی نابکاری! کہ دوسری طرف اسی ذہن میں خواجۂ ہند کا جو تصور ابھرتا ہے اس میں ان کے روحانی اقتدار کے اعتراف کے لیے قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جسمِ ظاہری کی محسوس شوکتوں، طلعتوں اور عطر بیز نکہتوں کے ساتھ کسی غم نصیب تک پہنچنے کی بات تو بہت بڑی ہے کہ یہ حضرات تو ان کے متعلق اتنی بات بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں کہ اُن کے کاکل و رُخ کی جلوہ گاہ میں پہنچ کر بھی کوئی فیضیاب ہو سکتا ہے!

اور جسارت ناروا کی انتہا تو یہ ہے کہ ان حضرات کے یہاں عطائے رسول کی تربت اور ایک بُت خانے کے درمیان قطعاً کوئی جوہری فرق نہیں ہے۔ نفع رسانی اور فیض بخشی کے سلسلے میں دونوں جگہ محرومی کا ایک ہی داغ ہے۔

خدا مہلت دے تو تھوڑی دیر ایمان و عقیدت کے سائے میں بیٹھ کر سوچیے گا کہ کیا سچ مچ یہی تصویر ہے اس خسروائے زمانہ کی، جسے رسول الثقلین نے کشورِ ہند میں اپنا نائب السلطنت بنا کر بھیجا ہے۔

اور جواب ملنے کی توقع ہو تو اپنے ضمیر سے اتنا ضرور دریافت کیجیے گا کہ قلم کی وہ روشنائی جو نانوتوی صاحب کی ''حمد'' میں گنگ و جمن کی طرح بہہ رہی تھی وہی خواجۂ خواجگانِ چشت کی منقبت کے سوال پر اچانک کیوں خشک ہو گئی؟

اتنی تفصیلات کے بعد اب یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ وفات یافتہ بزرگوں سے امداد کے مسئلے میں دیوبندی حضرات کا اصل مذہب کیا ہے؟ البتہ اس الزام کا جواب ہمارے ذمہ نہیں ہے کہ ایک ہی اعتقاد جو رسول و ولی کے حق میں شرک ہے وہی گھر کے بزرگوں کے حق میں اسلام و ایمان کیوں کر بن گیا ہے؟

اب آپ ہی فیصلہ کیجیے کہ یہ صورت حال کیا اس یقین کو تقویت نہیں پہنچاتی کہ ان حضرات کے یہاں کفر و شرک کی یہ ساری بحثیں صرف اس لیے ہیں کہ انبیا و اولیا کی حرمتوں کو گھائل کرنے کے

لیے اُنھیں ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جائے۔ ورنہ خالص عقیدۂ توحید کا جذبہ اس کے پس منظر میں کارفرما ہوتا تو شرک کے سوال پر اپنے اور بے گانے کے درمیان یہ تفریق کیوں روا رکھی جاتی؟

ضمنی طور پر یہ بحث نکل آئی ورنہ سلسلہ چل رہا تھا علماے دیوبند کی غیب دانی کا اور خدائی اختیارات سے متعلق تصنیف کردہ واقعات کا۔ اب پھر اسی سلسلے کے ساتھ اپنے ذہن کا رشتہ جوڑ لیجیے۔

(۳)

علمِ مَافِی الاَرحَام کا عجیب وغریب واقعہ:

مفتی عتیق الرحمٰن صاحب دہلوی جو دیوبندی جماعت کے مذہبی پیشوا اور دارالعلوم دیوبند کی مجلسِ شوریٰ کے اہم رکن ہیں اُنھوں نے ماہنامہ "بُرہان" دہلی کے مدیر مولوی سعید احمد اکبر آبادی فاضل دیوبند کے والد کی وفات پر جریدۂ بُرہان میں ایک تعزیتی شذرہ لکھا ہے جو متوفی کی زندگی کے حالات پر مشتمل ہے۔ واقعات کے راوی خود مولوی سعید احمد ہیں، قلم مُفتی عتیق الرحمٰن صاحب کا ہے۔ اپنی پیدائش سے متعلق مولوی سعید احمد کا "میلادنامہ" خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہے۔ موصوف بیان کرتے ہیں:

"مجھ سے پہلے ابا کے ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئے تھے جن کا نوعمری ہی میں انتقال ہوگیا تھا اس کے بعد مسلسل سترہ (۱۷) سال تک ان کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ انھوں نے ترکِ ملازمت اور ہجرت کا قصد کرلیا (اس وقت وہ آگرہ لوہامنڈی کے سرکاری شفاخانے میں ملازم تھے) مگر جب قاضی (عبدالغنی) صاحب مرحوم (والد کے پیرومُرشد) کو اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے منع لکھ بھیجا اور ساتھ ہی خوش خبری دی کہ ان کے لڑکا پیدا ہوگا، چنانچہ اس بشارت کے چند سال بعد ۸ء کے رمضان کی ۷ر تاریخ کو صبح صادق کے

وقت میں پیدا ہوا، تو ولادت سے دو گھنٹے قبل ابا نے حضرت مولانا گنگوہی اور حضرت مولانا نانوتوی کو خواب میں دیکھا کہ لوہامنڈی کے شفاخانے میں تشریف لائے ہیں اور فرماتے ہیں ڈاکٹر! لڑکا مبارک!!۔۔۔اس کا سعید نام رکھنا۔

چنانچہ ابا نے اس ارشاد کی تعمیل کی اور اسی وقت فیصلہ کرلیا کہ میں بچہ کو دیوبند بھیج کر عالم بناؤں گا۔"

(ماہنامہ بُرہان: دہلی، اگست ۵۲ء، ص:۲۸)

ذرا خالی الذہن ہوکر ایک لمحہ کے لیے سوچیے کہ مولوی سعید احمد صاحب کے والد کے پیر قاضی عبدالغنی صاحب نے موصوف کی پیدائش سے چند سال قبل ہی یہ معلوم کرلیا تھا کہ "فرزند" تشریف لا رہے ہیں۔ جس کی اُنھوں نے بشارت بھی دے دی اور بشارت کے مطابق ۷ر رمضان المبارک کو مولوی سعید احمد اس سرائے فانی میں تشریف بھی لے آئے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایامِ حمل میں اگر اُنھوں نے خبر دی ہوتی تو کہا جاسکتا تھا کہ طبّی ذرائع سے انھیں اُس کا ظن غالب ہوگیا ہوگا۔ لیکن کئی سالوں پیشتر یہ معلوم کرلینے کا ذریعہ سوائے اس کے اور کیا ہوسکتا ہے کہ اُنھیں "علمِ غیب" تھا۔

اور پھر مولوی قاسم صاحب نانوتوی اور مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی کی "غیب دانی" کا کیا کہنا کہ وہ حضرات تو عین وقتِ ولادت سے دو گھنٹے پیشتر ہی اپنی اپنی قبروں سے نکل کر سیدھے مولوی سعید صاحب کے والد کے پاس پہنچ گئے اور انھیں بیٹے کی آمد پر پیشگی مبارکباد دی اور نام تک تجویز فرمادیا اور موصوف نے بھی اس خواب کو بالکل ایک امرِ واقعہ کی طرح تسلیم کرلیا۔

انصاف کیجیے! ایک طرف تو گھر کے بزرگوں کے حق میں دلوں کا اعتقاد یہ ہے اور دوسری طرف رسولِ مجتبیٰ ﷺ کے علمِ غیب کے انکار میں بخاری شریف کی یہ حدیث دیوبندی علما کی زبان وقلم کی نوک سے ہمیشہ لگی رہتی ہے:

"صحیح بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مفاتیح الغیب جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں

جانتا وہ پانچ چیزیں ہیں جو سورۂ لقمان کی آخری آیت میں مذکور ہیں۔ یعنی قیامت کا وقت مخصوص، بارش کا ٹھیک وقت کہ کب نازل ہوگی، مافی الارحام یعنی عورت کے پیٹ میں کیا ہے؟ بچہ ہے یا بچی؟، مستقبل کے واقعات، موت کا صحیح مقام۔''

(فتح بریلی کا دلکش نظارہ، ص:۸۵)

قرآن کی آیت شریف بھی برحق اور حدیث بھی واجب التسلیم لیکن اتنا عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ مذکورہ بالا آیت وحدیث اگر رسول مجتبیٰ ﷺ کے حق میں علم مافی الارحام (یہ علم کہ ماں کے پیٹ میں کیا ہے؟) کے انکار کی دلیل بن سکتی ہے تو علم و دیانت کے حضور میں اس سوال کا جواب دیا جائے کہ یہی آیت اور یہی حدیث دیوبندی علما کے تئیں قاضی عبدالغنی، مولوی قاسم صاحب نانوتوی اور مولوی رشید احمد گنگوہی کے حق میں علم مافی الارحام کے اعتقاد سے کیوں نہیں مانع ہوئی؟

اور اگر اپنے بزرگوں کے حق میں مذکورہ بالا آیت وحدیث کی کوئی تاویل تلاش کر لی گئی تھی تو پھر وہی تاویل رسول مجتبیٰ ﷺ کے حق میں کیوں نہیں روا رکھی گئی؟ ایک ہی مسئلے میں ذہن کے دو رُخ کی وجہ سوائے اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ جسے اپنا سمجھا گیا اس کے کمالات کے اظہار کے لیے نہیں بھی کوئی گنجائش تھی تو نکال لی گئی اور جس کے لیے دل کے اندر کوئی نرم گوشہ تک موجود نہیں تھا اُس کے فضائل واقعی کے اعتراف میں دل کا بُخل چھپایا نہیں جا سکا۔

ایک اور ایمان شکن روایت:

علم مافی الارحام کی بات چل پڑی ہے تو لگے ہاتھوں عقیدہ توحید کا ایک اور خون ملاحظہ فرمائیے۔ یہی مولوی قاسم صاحب نانوتوی اپنی جماعت کے ایک ''شیخ'' کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شاہ عبدالرحیم صاحب ولایتی کے ایک مرید تھے جن کا نام عبداللہ خاں تھا اور قوم کے راجپوت تھے اور یہ حضرت کے خاص مُریدوں میں تھے ان کی حالت یہ تھی کہ اگر کسی کے گھر میں حمل ہوتا اور تعویذ لینے آتا تو آپ فرمادیا کرتے تھے کہ تیرے گھر میں لڑکی ہوگی یا لڑکا اور جو آپ بتلا دیتے وہی ہوتا تھا۔''

(ارواح ثلثہ، ص:۱۹۳)

یہاں تو حُسنِ اتفاق کا بھی معاملہ نہیں ہے اور ایسا بھی نہیں ہے کہ خواب کی بات ہو بلکہ پوری صراحت ہے اس امر کی کہ ان کے اندر مافی الارحام کے علم وانکشاف کی ایک ایسی قوت ہی بیدار ہوگئی تھی کہ وہ ہر وقت ایک شفاف آئینے کی طرح پیٹ کے اندر کی چیز دیکھ لیا کرتے تھے۔ بالکل اسی طرح کی قوت جیسے ہماری آنکھوں میں دیکھنے اور کانوں میں سننے کی ہے۔ نہ جبریل کا انتظار اور نہ الہام کی احتیاج!

لیکن وائے رے دیوبندی ذہن کی بوالعجبی! کہ علم وانکشاف کی جو معنوی قوت ایک ادنیٰ اُمتی کے لیے بے تکلف تسلیم کر لیتے ہیں وہی پیغمبر کے حق میں تسلیم کرتے ہوئے انھیں خدا کے ساتھ شرک کی قباحت نظر آنے لگتی ہے۔

ان ''موحدین'' کے طلسمِ فریب کا مزید تماشا دیکھنا چاہتے ہوں تو ایک طرف عبداللہ خاں راجپوت کے متعلق نانوتوی صاحب کی بیان کردہ روایت پڑھیے اور دوسری طرف دیوبندی مذہب کی بنیادی کتاب ''تقویۃ الایمان'' کا یہ فرمان ملاحظہ فرمائیے کہ:۔

''اسی طرح جو کچھ مادہ کے پیٹ میں ہے اُس کو بھی (خدا کے سوا) کوئی نہیں جان سکتا کہ ایک ہے یا دو، نر ہے یا مادہ، کامل ہے یا ناقص، خوبصورت ہے یا بدصورت''

(تقویۃ الایمان، ص:۲۲)

یہ ہے عقیدہ، وہ ہے واقعہ، اور دونوں ایک دوسرے کو جھٹلا رہے ہیں اگر دونوں صحیح ہیں تو ماننا پڑے گا کہ عبداللہ خاں خدائی منصب پر ہیں اگر انھیں خدا فرض نہیں کرتے تو کہیے کہ واقعہ غلط ہے اور اگر

واقعہ صحیح ہے تو تسلیم کیجیے کہ "تقویۃ الایمان" کا فرمان غلط ہے۔ تاویل و جواب کا جو رُخ بھی اختیار کیجیے مذہبی دیانت کا ایک خون ضروری ہے۔

اب آپ ہی انصاف کیجیے کہ یہ صورتِ حال کیا اس یقین کو تقویت نہیں پہنچاتی کہ ان حضرات کے یہاں کفر و شرک کی بحثیں صرف اس لیے ہیں کہ انبیا و اولیا کی حرمتوں کو گھائل کرنے کے لیے انھیں ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جائے۔ ورنہ خالص عقیدہ توحید کا جذبہ اس کے پسِ منظر میں کارفرما ہوتا تو شرک کے سوال پر اپنے اور بےگانے کی تفریق روا نہ رکھی جاتی۔

(۴)

غیب کا ایک عجیب مشاہدہ:

ارواحِ ثلٰثہ میں لکھا ہے کہ یہی مولوی قاسم صاحب نانوتوی جب حج کے لیے جانے لگے تو انہی عبداللہ خاں راجپوت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دمِ رخصت ان سے دعا کی درخواست کی۔ اس کے جواب میں خان صاحب نے فرمایا:۔

"بھائی میں تمہارے لیے کیا دعا کروں میں نے تو اپنی آنکھوں سے تمھیں دو جہان کے بادشاہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بخاری شریف پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔"

(ارواحِ ثلٰثہ، ص:۲۵۴)

دیوبندی جماعت کے ایک نومسلم خان کی آنکھوں کی ذرا قوتِ بینائی ملاحظہ فرمائیے کہ عالم غیب تک پہنچنے کے لیے اس پر درمیان کا کوئی حجاب حائل نہیں ہوا۔ لیکن رسول انور ﷺ کے حق میں دیوبندی حضرات کا یہ عقیدہ اب نشانِ مذہب قرار پا چکا ہے کہ معاذ اللہ "وہ پسِ دیوار بھی نہیں دیکھ سکتے۔"

نانوتوی صاحب کے ایک خادم کی قوّتِ انکشاف:

اب اکابر پرستی کی ایک خوں آشام کہانی اور ملاحظہ فرمائیے۔ اور موازنہ کیجیے کہ علماے دیوبند کے قلوب میں کس کے لیے کتنی گنجائش ہے؟

دیوان جی نامی ایک صاحب کے متعلق مولوی مناظر احسن گیلانی نے اپنی کتاب 'سوانح قاسمی' میں ایک نہایت حیرت انگیز واقعہ نقل کیا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:

"مولانا محمد طیب صاحب نے یہ اطلاع دی ہے کہ یٰسین نام کے دو صاحبوں کا خصوصی تعلق سیدنا الامام الکبیر (مولوی قاسم صاحب نانوتوی) سے تھا جن میں سے ایک تو یہی دیوان جی دیوبند کے رہنے والے تھے اور بقول مولانا طیب صاحب دیوبند میں حضرت والا کی خانگی اور ذاتی امور کا تعلق انہیں سے تھا۔

"لکھا ہے کہ صاحبِ نسبت بزرگ تھے اپنے زنانہ مکان کے حُجرے میں ذکر کرتے۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند فرمایا کرتے تھے کہ اس زمانے میں کشفی حالت دیوان جی کی اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ باہر سڑک پر آنے جانے والے نظر آتے رہتے تھے۔ در و دیوار کا حجاب اُن کے درمیان ذکر کرتے وقت باقی نہیں رہتا تھا۔"

(حاشیہ سوانح قاسمی، ج:۲، ص:۷۳)

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ! دیکھ رہے ہیں آپ! مولوی قاسم صاحب نانوتوی کے ایک خانگی خادم کی یہ کشفی حالت! کہ مٹی کی دیواریں شفاف آئینے کی طرح ان پر روشن رہا کرتی تھیں۔ لیکن فہم و اعتقاد کی اس گمراہی پر سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے کہ ان حضرات کے یہاں مٹی کی یہی دیواریں سرکارِ رسالت مآب ﷺ کی نگاہ پر حجاب بن کر حائل رہتی تھیں۔

جیسا کہ دیوبندی جماعت کے معتمد وکیل مولوی منظور صاحب نعمانی تحریر فرماتے ہیں:

"اگر حضور کو دیوار کے پیچھے کی سب باتیں معلوم ہو جایا کرتیں تو حضرت بلال

سے (دروازہ پر کھڑی ہونے والی عورتوں کا) نام لے کر دریافت کرنے کی کیا ضرورت ہوتی''

(فیصلہ کن مناظرہ، ص:۱۳۶)

آپ ہی انصاف کیجیے کہ اپنے رسول کے حق میں کیا اس سے بھی زیادہ جذبۂ دل کی بے گانگی کا کوئی تصور کیا جاسکتا ہے؟

دارالعلوم دیوبند میں الحاد و نصرانیت کا ایک مکاشفہ:

لگے ہاتھوں انھی دیوان جی کا ایک کشف اور ملاحظہ فرمائیے۔ مولوی مناظر احسن گیلانی اپنے اسی حاشیہ میں یہ روایت نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان ہی دیوان جی کے مکاشفہ کا تعلق دارالعلوم دیوبند سے بھی نقل کیا جاتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ مثالی عالم میں ان پر منکشف ہوا کہ دارالعلوم کے چاروں طرف ایک سُرخ ڈورا تنا ہوا ہے۔

اپنے اس کشفی مشاہدے کی تعبیر خود یہ کیا کرتے تھے کہ نصرانیت اور تجدد و آزادی کے آثار ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دارالعلوم میں نمایاں ہوں گے۔''

(حاشیہ سوانح قاسمی، ج:۲، ص:۷۳)

مجھے اس مقام پر اس کے سوا اور کچھ نہیں کہنا ہے کہ جو لوگ اپنا عیب چھپانے کے لیے دوسروں پر انگریزوں کی کاسہ لیسی اور ساز باز کا الزام عائد کرتے ہیں وہ گریبان میں منہ ڈال کر ذرا اپنے گھر کا یہ کشف نامہ ملاحظہ فرمالیں۔ کتاب کے مصنفین کو اس کشف پر اگر اعتماد نہ ہوتا تو ہرگز اسے شائع نہ کرتے۔

اور بات کشف ہی تک نہیں ہے تاریخی دستاویزات بھی امر واقعہ کی تائید میں ہیں کہ انگریزوں کے ساتھ نیاز مندانہ تعلقات اور راز دارانہ ساز باز دارالعلوم دیوبند اور منتظمین و عمائدین کا ایسا نمایاں کارنامہ ہے جسے اُنھوں نے فخر کے ساتھ بیان کیا ہے۔

اور یہ بات بھی ازراہِ الزام نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ دیوبندی لٹریچر سے جو تاریخی شہادتیں مجھے موصول ہوئی ہیں ان کی روشنی میں اس کے سوا اور کچھ کہا ہی نہیں جاسکتا مطلع ہونے کے طور پر چند تاریخی حوالے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

انگریزوں کے خلاف افسانۂ جہاد کی حقیقت:

ایک دیوبندی فاضل نے ''مولانا محمد احسن نانوتوی'' کے نام سے موصوف کی سوانح حیات لکھی ہے جسے مکتبۂ عثمانیہ کراچی پاکستان نے شائع کیا ہے۔ اپنی کتاب میں مصنف نے اخبار ''انجمن'' پنجاب لاہور مجریہ ۱۹ر فروری ۱۸۷۵ء کے حوالے سے لکھا ہے کہ ۳۱ر جنوری ۱۸۷۵ء بروز یکشنبہ لفٹیننٹ گورنر کے ایک خفیہ معتمد انگریز مسمّٰی پامر نے مدرسہ دیوبند کا معائنہ کیا۔ معائنہ کی جو عبارت موصوف نے اپنی کتاب میں نقل کی ہے اس کی چند سطریں خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہیں:

''جو کام بڑے بڑے کالجوں میں ہزاروں روپے کے صرف سے ہوتا ہے وہ یہاں کوڑیوں میں ہو رہا ہے۔ جو کام پرنسپل ہزاروں روپیہ ماہانہ تنخواہ لے کر کرتا ہے وہ یہاں ایک مولوی چالیس روپیہ ماہانہ پر کررہا ہے۔ یہ مدرسہ خلاف سرکار نہیں بلکہ موافقِ سرکار و ممد و معاون سرکار ہے۔''

(مولانا محمد احسن نانوتوی، ص:۲۱۷)

ع: مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری

خود انگریز کی شہادت ہے کہ ''یہ مدرسہ خلاف سرکار نہیں بلکہ موافقِ سرکار و ممد و معاونِ سرکار ہے۔''

اب آپ ہی انصاف کیجیے کہ اس بیان کے سامنے اب اُس افسانے کی کیا حقیقت ہے جس کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے کہ مدرسہ دیوبند انگریزی سامراج کے خلاف سیاسی سرگرمیوں کا بہت بڑا اڈہ تھا۔

مدرسہ دیوبند کے قدیم کارکنوں کا انگریزوں کے ساتھ کس درجہ خیر خواہانہ اور نیاز مندانہ

تعلق تھا۔اس کا اندازہ لگانے کے لیے خود قاری طیّب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کا یہ تہلکہ خیز بیان پڑھیے۔فرماتے ہیں:

"مدرسہ دیوبند کے کارکنوں میں اکثریت ایسے بزرگوں کی تھی جو گورنمنٹ کے قدیم ملازم اور حال پنشنرز تھے۔جن کے بارے میں گورنمنٹ کو شک وشبہ کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔"

(حاشیہ سوانح قاسمی، ج:۲، ص:۲۴۷)

آگے چل کر انھیں "بزرگوں" کے متعلق لکھا ہے کہ مدرسۂ دیوبند میں ایک موقع پر گورنمنٹ کی جب انکوائری آئی تو۔۔۔

"اس وقت یہی حضرات آگے بڑھے اور اپنے سرکاری اعتماد کو سامنے رکھ کر مدرسہ کی طرف سے صفائی پیش کی جو کارگر ہوئی۔"

(حاشیہ سوانح قاسمی)

گھر کا رازدار ہونے کی حیثیت سے قاری طیّب صاحب کا بیان جتنا باوزن ہو سکتا ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔

اب آپ ہی فیصلہ کیجیے کہ جس مدرسہ کے چلانے والے انگریزوں کے وفا پیشہ نمک خوار ہوں اُسے باغیانہ سرگرمیوں کا اڈہ کہنا آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف ہے یا نہیں؟

اب انگریزوں کے خلاف دیوبندی اکابر کے افسانۂ جہاد و بغاوت کی پوری بساط اُلٹ دینے والی ایک سنسنی خیز کہانی اور سُنیے۔

سوانح قاسمی میں مولوی قاسم صاحب نانوتوی کے ایک حاضر باش مولوی، مولوی منصور علی خاں کی زبانی یہ قصہ بیان کیا گیا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ ایک دن مولانا نانوتوی کے ہمراہ میں نانوتہ جارہا تھا کہ اثنائے راہ میں مولانا کا حجام افتاں وخیزاں آتا ہوا ملا۔اور اس نے خبر دی کہ نانوتہ کے تھانے دار نے ایک عورت کے بھگانے کے الزام میں میرا چالان کر دیا ہے۔خدارا مجھے بچایئے۔

مولوی منصور علی خاں کا بیان ہے کہ نانوتہ پہنچتے ہی مولانا نے اپنے مخصوص کارندہ منشی محمد سلیمان کو طلب کیا اور پُرجلال آواز میں فرمایا:

"اس غریب کو تھانے دار نے بے قصور پکڑا ہے۔تم اس سے کہہ دو کہ یہ (حجام) ہمارا آدمی ہے اس کو چھوڑ دو، ورنہ تم بھی نہ بچو گے اس ہاتھ میں ہتھکڑی ڈالو گے تو تمہارے ہاتھ میں بھی ہتھکڑی پڑے گی۔"

(سوانح قاسمی، ج:۱، ص:۳۲۱/۳۲۲)

لکھا ہے کہ منشی محمد سلیمان نے مولانا نانوتوی کا حکم ہُو بہُو تھانے دار تک پہنچا دیا، تھانے دار نے جواب دیا کہ اب کیا ہو سکتا ہے۔روزنامچہ میں اس کا نام لکھ دیا گیا ہے۔

مولانا نانوتوی نے اس جواب پر حکم دیا کہ تھانے دار سے جا کر کہہ دو کہ اس کا نام روزنامچہ سے کاٹ دو۔منصور علی خاں کا بیان ہے کہ مولانا کا یہ حکم پا کر سراسیمگی کی حالت میں تھانے دار خود ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا:

"حضرت نام نکالنا بڑا جرم ہے۔اگر نام اس کا نکالا تو میری نوکری جاتی رہے گی۔فرمایا اس کا نام (روزنامچہ سے) کاٹ دو، تمہاری نوکری نہیں جائے گی۔"

(سوانح قاسمی، ج:۱، ص:۳۲۳)

واقعہ کا راوی کہتا ہے کہ "مولانا کے حکم کے مطابق تھانے دار نے حجام کو چھوڑ دیا، اور تھانے دار، تھانے دار ہی رہا۔"

مجھے اس واقعے پر بجز اس کے اور کوئی تبصرہ نہیں کرنا ہے کہ مولوی قاسم صاحب نانوتوی اگر انگریزی حکومت کے باغیوں میں تھے تو پولس کا محکمہ اس قدر ان کے تابع فرمان کیوں تھا؟ اور تھانے دار کو یہ دھمکی کہ "اسے چھوڑ دو ورنہ تم بھی نہ بچو گے۔" وہی دے سکتا ہے جس کا ساز باز اوپر کے مرکزی حکام سے ہو۔

انگریزی قوم کی بارگاہ میں نیازمندانہ ذہن کا ایک رُخ اور ملاحظہ فرمایئے:

اس سلسلے میں سوانح قاسمی کے مصنف کی ایک عجیب وغریب روایت سُنیے۔فرماتے ہیں کہ:

"انگریزوں کے مقابلے میں جو لوگ لڑ رہے تھے۔ ان میں حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے اچانک ایک دن مولانا کو دیکھا گیا کہ خود بھاگے جا رہے ہیں اور کسی چودھری کا نام لے کر جو باغیوں کی فوج کی افسری کر رہے تھے کہتے جاتے تھے کہ لڑنے کا کیا فائدہ؟ خضر کو تو میں انگریزوں کی صف میں پا رہا ہوں۔"

(حاشیہ سوانح قاسمی، ج:۲، ص:۱۰۳)

انگریزوں کی صف میں حضرت خضر کی موجودگی اتفاقاً نہیں پیش آ گئی تھی بلکہ وہ "نصرتِ حق" کی علامت بن کر انگریزی فوج کے ساتھ ایک بار اور دیکھے گئے تھے جیسا کہ فرماتے ہیں:

"غدر کے بعد جب گنج مرادآباد کی ویران مسجد میں حضرت مولانا (شاہ فضل الرحمٰن صاحب) جا کر مقیم ہوئے تو اتفاقاً اُسی راستے سے جس کے کنارے مسجد ہے کسی وجہ سے انگریزی فوج گزر رہی تھی، مولانا مسجد سے دیکھ رہے تھے۔ اچانک مسجد کی سیڑھیوں سے اُتر کر دیکھا گیا کہ انگریزی فوج کے ایک سائیس سے جو باگ ڈور، کھونٹے وغیرہ گھوڑے کا لیے ہوئے تھا۔ اس سے باتیں کر کے پھر مسجد میں آ گئے۔

اب یاد نہیں رہا کہ پوچھنے پر یا خود بخود فرمانے لگے کہ سائیس جس سے میں نے گفتگو کی یہی خضرؑ تھے۔ میں نے پوچھا یہ کیا حال ہے تو جواب ملا کہ حکم یہی ہوا ہے۔"

(حاشیہ سوانح قاسمی، ج:۲، ص:۱۰۳)

یہاں تک تو روایت تھی اب اس روایت کی توثیق و تشریح ملاحظہ فرمایئے۔ لکھتے ہیں:

"باقی خود خضر کا مطلب کیا ہے؟ نصرتِ حق کی مثالی شکل تھی جو اس نام سے ظاہر ہوئی۔ تفصیل کے لیے شاہ ولی اللہ وغیرہ کی کتابیں پڑھیے گویا جو کچھ دیکھا جا رہا تھا۔ اسی کے باطنی پہلو کا یہ مکاشفہ تھا۔"

(حاشیہ سوانح قاسمی، ج:۲، ص:۱۰۳)

بات ختم ہو گئی لیکن یہ سوال سر پر چڑھ کے آواز دے رہا ہے کہ جب حضرت خضر کی صورت میں نصرتِ حق انگریزی فوج کے ساتھ تھی تو ان باغیوں کے لیے کیا حکم ہے جو حضرت خضر کے مقابلے میں لڑنے آئے تھے؟ کیا اب بھی انھیں غازی اور مجاہد کہا جا سکتا ہے؟

اپنے موضوع سے ہٹ کر ہم بہت دور نکل آئے لیکن آپ کی نگاہ پر بار نہ ہو تو اس بحث کے خاتمے پر اکابر دیوبند کی ایک دلچسپ دستاویز اور ملاحظہ فرما لیجیے۔

دیوبندی حلقے کے ممتاز مصنف مولوی عاشق الٰہی میرٹھی اپنی کتاب "تذکرۃ الرشید" میں انگریزی حکومت کے ساتھ مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی کے نیازمندانہ جذبات کی تصویر کھینچتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

"(آپ) سمجھے ہوئے تھے کہ میں جب حقیقت میں سرکار کا فرمانبردار ہوں تو جھوٹے الزام سے میرا بال بیکا نہ ہوگا اور اگر مارا بھی گیا تو سرکار مالک ہے اُسے اختیار ہے جو چاہے کرے۔"

(تذکرۃ الرشید، ج:۱، ص:۸۰)

کچھ سمجھا آپ نے؟ کس الزام کو یہ جھوٹا کہہ رہے ہیں۔ یہی کہ انگریزوں کے خلاف اُنھوں نے علمِ جہاد بلند کیا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ گنگوہی صاحب کی یہ پُرخلوص صفائی کوئی مانے یا نہ مانے لیکن کم از کم اُن کے معتقدین کو تو ضرور ماننا چاہیے۔ لیکن غضبِ خدا کا اتنی شدومد کے ساتھ صفائی کے باوجود بھی اُن کے ماننے والے یہ الزام اُن پر آج تک دُہرا رہے ہیں کہ اُنھوں نے انگریزوں کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا تھا۔ دنیا کی تاریخ میں اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی کہ کسی فرقے کے افراد نے اپنے پیشوا کی اس طرح تکذیب کی ہو۔

اور "سرکار مالک ہے سرکار کو اختیار ہے" یہ جملے اسی کی زبان سے نکل سکتے ہیں جو "تن" سے لے کر "من" تک پوری طرح کسی کے جذبۂ غلامی میں بھیگ چکا ہو۔

آہ! دلوں کی بدبختی اور روحوں کی شقاوت کا حال بھی کتنا عبرت انگیز ہوتا ہے سوچتا ہوں

تو دماغ پھٹنے لگتا ہے کہ خدا کے باغیوں کے لیے تو جذبۂ عقیدت کا یہ اعتراف ہے کہ وہ مالک بھی ہیں اور مختار بھی! لیکن احمد مجتبیٰ اور محبوبِ کبریا ﷺ کی جناب میں اُن حضرات کے عقیدے کی زبان یہ ہے:

"جس کا نام محمد یا علی ہے وہ کسی چیز کا مختار (مالک) نہیں۔"

(تقویۃ الایمان، ص:۰۷)

بے شک یہ بتانے کا حق مملوک ہی کو ہے کہ اس کا مالک کون ہے کون نہیں ہے؟ جو مالک تھا اس کے لیے اعتراف کی زبان کھُلنی تھی کھل گئی۔ اور جو مالک نہیں تھا اُس کا انکار ضروری تھا ہوگیا۔ اب یہ بحث بالکل عبث ہے کہ کس کا مقدر کس مالک کے ساتھ وابستہ ہوا۔

یہاں پہنچ کر ہمیں کچھ نہیں کہنا ہے۔ تصویر کے دونوں رُخ آپ کے سامنے ہیں۔ مادّی منفعت کی کوئی مصلحت مانع نہ ہو تو آپ ہی فیصلہ کیجیے کہ دلوں کی اقلیم پر کس کی بادشاہت کا جھنڈا گڑا ہوا ہے۔ سلطان الانبیا کا یا تاجِ برطانیہ کا؟

بات چلی تھی گھر کے مکاشفہ کی اور گھر ہی کی دستاویز پر ختم ہوگئی اب پھر کتاب کے اصل موضوع کی طرف پلٹتا ہوں۔ آپ بھی اپنے ذہن کا رشتہ واقعات کے سلسلے سے منسلک کر لیجیے۔

(۵)

غیبی ادراک کے سمندر میں تلاطم:

مولوی مناظر احسن صاحب گیلانی نے اپنی کتاب سوانح قاسمی میں ارواحِ ثلثہ کے حوالے سے ایک نہایت حیرت انگیز واقعہ نقل کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ چھتہ کی مسجد واقع دیوبند میں کچھ لوگ جمع تھے۔ اس مجمع میں ایک دن مولوی یعقوب صاحب نانوتوی مہتمم مدرسہ دیوبند، فرمانے لگے:

"بھائی آج تو صبح کی نماز میں ہم مرجاتے، بس کچھ ہی کسر رہ گئی۔"

لوگ حیرت سے پوچھنے لگے آخر کیا حادثہ پیش آیا۔ سننے کی بات یہی ہے، جواب

میں فرما رہے تھے کہ "آج صبح میں سورۂ مزمل پڑھ رہا تھا" کہ اچانک علوم کا اتنا عظیم الشان دریا میرے قلب کے اوپر گذرا کہ میں تحمل نہ کر سکا "اور قریب تھا کہ میری روح پرواز کر جائے۔" کہتے تھے کہ وہ تو خیر گذری کہ "وہ دریا جیسا کہ ایک دم آیا تھا" ویسا ہی نکلا چلا گیا" اس لیے میں بچ گیا۔"

کہتے تھے کہ علوم کا یہ دریا جو اچانک چڑھتا ہوا ان کے قلب پر سے گذر گیا یہ کیا تھا؟ خود ہی اس کی تشریح بھی اُن ہی سے بایں الفاظ اسی کتاب میں پائی جاتی ہے"

"نماز کے بعد میں نے غور کیا کہ یہ کیا معاملہ تھا" تو منکشف ہوا کہ حضرت مولانا نانوتوی ان ساعتوں میں میری طرف میرٹھ میں متوجہ ہوئے تھے" یہ ان کی توجہ کا اثر ہے" کہ علوم کے دریا دوسروں کے قلوب پر موجیں مارنے لگے اور تحمل دُشوار ہو جائے۔"

(سوانح قاسمی، ج:۱، ص:۳۴۵)

اصل واقعہ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"خود ہی بتایئے کہ فکری اور دماغی علم والے بھلا اس کا کیا مطلب سمجھ سکتے ہیں؟ کہاں میرٹھ اور کہاں چھتہ کی مسجد! میرٹھ سے دیوبند کا مکانی فاصلہ درمیان میں حائل نہ ہوا۔"

(سوانح قاسمی، ج:۱، ص:۳۴۵)

بتایئے! اب اِس اَن کہی کو کیا کہا جائے؟ یہ معمہ تو گیلانی صاحب اور ان کی جماعت کے علما ہی حل کر سکتے ہیں کہ جو فاصلۂ مکانی ان حضرات کے نزدیک انبیا اور سید الانبیا تک پر حائل رہتا ہے وہ نانوتوی صاحب پر کیوں نہیں حائل ہوا؟ اور مولوی یعقوب صاحب کی غیبی قوتِ ادراک کا کیا کہنا کہ انھوں نے تو دیوبند میں بیٹھے بیٹھے مولوی قاسم صاحب نانوتوی کی وہ غیبی توجہ تک معلوم کر لی جو انھوں نے میرٹھ سے ان کی طرف مبذول کی تھی۔ اور وہ بھی اتنا جھٹ پٹ کہ نماز کے بعد غور کیا اور سارا معاملہ اسی لمحے منکشف ہوگیا۔ دنوں، ہفتوں اور مہینوں کی بات تو الگ رہی، گھنٹے آدھ گھنٹے کا

بھی وقفہ نہ گزرا۔ لیکن شرم سے سر جھکا لیجیے کہ گھر کے بزرگوں کا تو یہ حال بیان کیا جاتا ہے اور رسول مجتبیٰ ﷺ کے حق میں پوری جماعت کا عقیدہ یہ ہے:

''بہت سے امور میں آپ کا خاص اہتمام سے توجہ فرمانا بلکہ فکر و پریشانی میں واقع ہونا اور باوجود اس کے پھر مخفی رہنا ثابت ہے۔ قصۂ اِفک میں آپ کی تفتیش و استکشاف بالغ وجوہ صحاح میں مذکور ہے مگر صرف توجہ سے انکشاف نہیں ہوا۔ بعد ایک ماہ کے وحی کے ذریعہ اطمینان ہوا۔''

(حفظ الایمان، ص:۷، مولفہ: مولوی اشرف علی صاحب تھانوی)

اب اس بے وفائی کا انصاف تو رسولِ عربی (ﷺ) کی وفا و امانت ہی کرے گی کہ خود تو یہ حضرات آنِ واحد میں سیکڑوں میل کی مسافت سے دلوں کے مخفیات پر مطلع ہو جاتے ہیں۔ لیکن رسولِ انور ﷺ کے لیے ایک ماہ کی طویل مدت میں بھی کسی مخفی امر کے انکشاف کی قوت تسلیم نہیں کرتے۔

کیا اتنی کھلی ہوئی شہادتوں کے بعد بھی حق و باطل کی راہوں کا امتیاز محسوس کرنے کے لیے مزید کسی نشانی کی ضرورت باقی رہ گئی ہے؟ محشر کی تپتی ہوئی سرزمین پر رسولِ عربی (ﷺ) کی شفاعت کے امیدوارو! جواب دو؟؟

کسی بھی کتاب کے قارئین کے لیے وہ مرحلہ سخت آزمائش کا ہوتا ہے جب دیانت و انصاف کا تقاضا پورا کرنے کے لیے اپنے ممدوح کے خلاف فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔

(۶)

غیبی قوت ادراک کے تصرف کا ایک عجیب و غریب واقعہ:

ارواحِ ثلٰثہ میں مولوی قاسم صاحب نانوتوی کے ایک شاگرد رشید مولوی منصور علی خاں مرادآبادی کی ایک جنون انگیز ''آپ بیتی'' نقل کی گئی ہے۔ خود مولوی منصور علی خاں کی زبانی یہ دلچسپ اور پُراسرار قصہ سنیے۔ بیان کرتے ہیں:

''مجھے ایک لڑکے سے عشق ہو گیا اور اس قدر اس کی محبت نے طبیعت پر غلبہ پایا کہ رات دن اسی کے تصور میں گزرنے لگے۔ میری عجیب حالت ہو گئی۔ تمام کاموں میں اختلال ہونے لگا۔ حضرت (مولانا نانوتوی) کی فراست نے بھانپ لیا۔ لیکن سبحان اللہ! تربیت و نگرانی اسے کہتے ہیں کہ نہایت بے تکلفی کے ساتھ حضرت نے میرے ساتھ دوستانہ برتاؤ شروع کیا اور اسے اس قدر بڑھایا کہ جیسے دو یار آپس میں بے تکلف دل لگی کیا کرتے ہیں۔

یہاں تک کہ خود ہی اس محبت کا ذکر چھیڑا، فرمایا، ہاں بھائی وہ تمہارے پاس آتے بھی ہیں یا نہیں؟ میں شرم و حجاب سے چپ رہ گیا تو فرمایا نہیں بھائی یہ حالات تو انسان ہی پر آتے ہیں اس میں چھپانے کی کیا بات ہے۔ غرض اس طریق سے مجھ سے بات کی کہ میری ہی زبان سے اس محبت کا اقرار کرا لیا اور کوئی خفگی اور ناراضگی نہیں ظاہر کی بلکہ دلجوئی فرمائی۔''

(ارواحِ ثلٰثہ، ص:۲۴۶)

اس کے بعد لکھا ہے کہ جب میری بے چینی بہت زیادہ بڑھ گئی اور عشق کے ہاتھوں میں بالکل تنگ آ گیا تو ناچار ایک دن مولانا نانوتوی کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا:

''حضرت! للہ میری اعانت فرمائیے۔ میں تنگ آ گیا ہوں اور عاجز ہو چکا ہوں ایسی دعا فرما دیجیے کہ اس لڑکے کا خیال تک میرے قلب سے محو ہو جائے، تو ہنس کر فرمایا کہ بس مولوی صاحب کیا تھک گئے۔ بس جوش ختم ہو گیا؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت! میں سارے کاموں سے بے کار ہو گیا، نکما ہو گیا اب مجھ سے یہ برداشت نہیں ہو سکتا۔ خدا کے لیے میری امداد فرمائیے۔ فرمایا بہت اچھا! بعد مغرب جب میں نماز سے فارغ ہوں تو آپ موجود رہیں۔''

(ارواحِ ثلٰثہ، ص:۲۴۷)

اب نماز کے بعد کا واقعہ سنیے۔ ''مبتلائے غمِ جاناں'' بیان کرتا ہے کہ:

"میں مغرب کی نماز پڑھ کر چھتہ کی مسجد میں بیٹھا رہا۔ جب حضرت صلوٰۃ الاوابین سے فارغ ہوئے تو آواز دی مولوی صاحب! میں نے عرض کیا حضرت حاضر ہوں۔ میں سامنے حاضر ہوا اور بیٹھ گیا۔ فرمایا کہ ہاتھ لاؤ۔ میں نے ہاتھ بڑھایا۔ میرا ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ کر میری ہتھیلی کو اپنی ہتھیلی سے اس طرح رگڑا جیسے بان بٹے جاتے ہیں۔ خدا کی قسم میں نے بالکل عیاناً (کھلی آنکھوں سے) دیکھا کہ میں عرش کے نیچے ہوں اور ہر چہار طرف نور اور روشنی نے میرا احاطہ کرلیا ہے گویا میں دربار الٰہی میں حاضر ہوں۔"

(ارواحِ ثلٰثہ، ص:۲۴۷)

غیب کی نقاب کشائی کی ذرا یہ شان ملاحظہ فرمایئے کہ پارس پتھر کی طرح ہتھیلی پر ہتھیلی رگڑتے ہی آنکھیں روشن ہوگئیں اور عرش تک کے سارے حجابات آنِ واحد میں اُٹھ گئے اور صرف اُٹھ ہی نہیں گئے بلکہ اپنے "رنگین مزاج" شاگرد کو پلک جھپکتے وہاں پہنچادیا جہاں بجز سید الانبیا ﷺ کے عالمِ گیتی کا کوئی انسان اب تک نہیں پہنچ سکا۔

عالمِ غیب پر اپنے اقتدار کے تسلط کا تو یہ حال بیان کیا جاتا ہے کہ جسے چاہا غیب داں بنا دیا۔ لیکن محبوبِ کبریا ﷺ کے حق میں بیک زبان سب متفق ہیں کہ کسی اور کو حرم سرائے غیب کا محرم بنانا تو بڑی بات ہے کہ وہ خود غیب کی بات نہیں جانتے اور عرش کا تو پوچھنا ہی کیا ہے کہ فرش بھی ان کی نگاہ سے اوجھل ہے۔

آپ ہی منصفی سے کہیے کہ کیا یہی شیوۂ اسلام اور تقاضائے کلمہ گوئی ہے؟

دیوبندی مکتبِ فکر کی بنیاد ہلا دینے والی ایک کہانی:

مولوی مناظر احسن صاحب گیلانی نے ان ہی مولوی قاسم صاحب نانوتوی کے متعلق اپنی کتاب سوانح قاسمی میں اچنبھے میں ڈال دینے والی ایک حکایت بیان کی ہے۔

لکھتے ہیں کہ ایک بار مولانا موصوف کا کسی ایسے گاؤں میں گزر ہوا جہاں شیعوں کی کثیر آبادی تھی۔ سنیوں کو جب ان کی آمد کی خبر ہوئی تو موقع غنیمت جانا اور ان کے وعظ کا اعلان کردیا۔ اعلان سنتے ہی شیعوں میں ایک کھلبلی مچ گئی۔ اُنھوں نے جلسۂ وعظ کو ناکام بنانے کے لیے لکھنؤ سے چار مجتہد بلائے اور پروگرام یہ طے پایا کہ مجلس وعظ میں چاروں کونوں پر یہ چاروں مجتہد بیٹھ جائیں اور چالیس اعتراض منتخب کرکے دس دس اعتراض چاروں پر بانٹ دیے گئے کہ اثنائے وعظ میں ہر ایک مجتہد الگ الگ اعتراض کرے اور اس طرح جلسۂ وعظ کو درہم برہم کردیا جائے۔ اب اس کے بعد کا واقعہ خود سوانح نگار کے الفاظ میں سنیے، لکھتے ہیں:

"حضرت والا کی کرامت کا حال سُنیے کہ حضرت نے وعظ شروع فرمایا جس میں گاؤں کی تمام شیعہ برادری بھی جمع تھی اور وہ وعظ اسی ترتیب سے اعتراضوں کے جواب پر مشتمل شروع ہوا جس ترتیب سے اعتراضات لے کر مجتہدین بیٹھے تھے۔ گویا ترتیب کے مطابق جب کوئی مجتہد اعتراض کرنے کے لیے گردن اُٹھاتا تو حضرت اسی اعتراض کو خود نقل کرکے جواب دینا شروع فرماتے۔ یہاں تک کہ وعظ پورے سکون کے ساتھ پورا ہوا۔"

(حاشیہ سوانح قاسمی، ج:۲، ص:۱۷)

اس واقعہ کے بعد جو واقعہ پیش آیا وہ اس سے بھی زیادہ عبرت ناک اور دلچسپ ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

"مجتہدین اور مقامی شیعہ چودھریوں کی اس میں اپنی انتہائی سبکی اور خفت محسوس ہوئی تو اُنھوں نے حرکتِ مذبوحی کے طور پر اس شرمندگی کو مٹانے اور حضرتِ والا کے اثرات کا ازالہ کرنے کے لیے یہ تدبیر کی کہ ایک نوجوان کا فرضی جنازہ بنایا اور حضرت سے آکر عرض کیا کہ حضرت نمازِ جنازہ آپ پڑھادیں۔ پروگرام یہ تھا کہ جب حضرت دو تکبیر کہہ لیں تو صاحبِ جنازہ ایک دم اُٹھ کھڑا ہو اور اس پر حضرت کے ساتھ استہزا اور تمسخر کیا جائے۔ حضرتِ والا نے معذرت فرمائی کہ آپ لوگ شیعہ ہیں اور میں سُنّی ہوں۔ اُصولِ نماز الگ الگ ہیں۔ آپ

کے جنازے کی نماز مجھ سے پڑھوانی جائز کب ہوگی؟ شیعوں نے عرض کیا کہ حضرت! بزرگ ہر قوم کا بزرگ ہی ہوتا ہے آپ تو نماز پڑھا ہی دیں۔

حضرت نے ان کے اصرار پر منظور فرمالیا۔ اور جنازے پر پہنچ گئے، مجمع تھا۔ حضرت ایک طرف کھڑے ہوئے تھے کہ چہرے پر غصّے کے آثار دیکھے گئے آنکھیں سُرخ تھیں اور انقباض چہرے سے ظاہر تھا۔ نماز کے لیے کہا گیا تو آگے بڑھے اور نماز شروع کردی۔ دو تکبیر کہنے پر جب طے شدہ پروگرام کے مطابق جنازے میں حرکت نہ ہوئی تو پیچھے سے کسی نے ''ہونہہ'' کے ساتھ سسکاری دی۔ مگر وہ نہ اُٹھا۔

حضرت نے تکبیرات اربعہ پوری کر کے اسی غُصّے کے لہجے میں فرمایا کہ اب یہ قیامت کی صبح سے پہلے نہیں اُٹھ سکتا۔ دیکھا گیا تو وہ مردہ تھا۔ شیعوں میں رونا پیٹنا پڑ گیا۔''

(حاشیہ سوانح قاسمی، ج:۲، ص:۱۷)

قسم ہے آپ کو جلالتِ خداوندی کی جس کی ہیبت سے مومن کا کلیجہ لرزتا رہتا ہے۔ حق کے ساتھ انصاف کرنے میں کسی کی پاسداری نہ کیجیے گا۔

یہ دونوں واقعے آپ کے سامنے ہیں۔ پہلے واقعے میں نانوتوی صاحب کے لیے غیبی علم وادراک کی وہ عظیم قوت ثابت کی گئی ہے جس کے ذریعے اُنہوں نے الگ الگ مجتہدین کے دل میں چھپے اعتراض کو اسی ترتیب کے ساتھ معلوم کر لیا جس ترتیب کے ساتھ وہ اپنے اپنے دلوں میں چھپا کر لائے تھے۔

گھر کے بزرگ کے لیے تو جذبۂ اعتراف کی یہ فراوانی ہے کہ دلوں کے چھپے ہوئے خطرات آئینے کی طرح ان کے پیشِ نظر ہیں۔ اپنے مولانا کے لیے اس غیبی قوتِ ادراک کا اعتراف کرتے ہوئے نہ شرک کا کوئی قانون دامن گیر ہوا اور نہ مشربِ توحید سے کوئی انحراف نظر آیا۔ لیکن انبیا و اولیا کے حق میں اسی غیبی قوتِ ادراک کے سوال پر ان حضرات کے عقیدے کی زبان یہ ہے:

''کچھ اس بات میں بھی ان کو بڑائی نہیں ہے کہ اللہ نے غیب دانی اختیار میں دے دی ہو کہ جس کے دل کا احوال جب چاہیں معلوم کر لیں یا جنگل غائب کا احوال جب چاہیں معلوم کر لیں کہ وہ جیتا ہے یا مر گیا یا کس شہر میں ہے۔''

(تقویۃ الایمان، ص:۲۵)

انصاف و دیانت کی روشنی میں چلنے کی تمنا کرنے والو! حق و باطل کی راہوں کا امتیاز محسوس کرنے کے لیے کیا اب بھی کسی مزید نشانی کی ضرورت ہے؟

ایک واقعے پر تبصرہ ختم ہوا اب دوسرے واقعے پر اپنی توجہ مبذول فرمایئے۔ واقعے کی یہ تفصیل تو اپنی جگہ پر ہے کہ نمازِ جنازہ کے لیے کھڑے ہوئے تو فرطِ غضب سے آنکھیں سُرخ تھیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ موصوف کو اپنی غیبی قوتِ ادراک کے ذریعے پہلے ہی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ تابوت کے اندر کا جنازہ مُردہ نہیں بلکہ زندہ ہے۔ اور صرف ازراہِ تمسخر اُنھیں نمازِ جنازہ پڑھانے کے لیے کہا گیا ہے

لیکن کہانی کا نقطۂ عروج یہ ہے کہ انھوں نے تکبیراتِ اربعہ پوری کرنے کے بعد اسی غصّے کے لہجے میں فرمایا کہ ''اب یہ قیامت کی صبح سے پہلے نہیں اُٹھ سکتا۔'' اس فقرے کا مدعا سوا اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ موصوف کی قوتِ تصرف سے اچانک اس کی موت واقع ہو گئی اور معاً اس کا علم بھی انہیں ہو گیا۔

اب ٹھیک اس روایت کی دوسری سمت میں دیوبندی مذہب کی بنیادی کتاب 'تقویۃ الایمان' کی یہ عبارت پڑھیے اور دریائے حیرت میں غوطہ لگایئے۔

''عالم میں ارادہ سے تصرف کرنا اور اپنا حکم جاری کرنا اور اپنی خواہش سے مارنا اور جلانا یہ سب اللہ ہی کی شان ہے اور کسی انبیاء و اولیاء کی، پیر و مرشد کی، بھوت و پری کی یہ شان نہیں۔ جو کوئی کسی کو ایسا تصرف ثابت کرے سو وہ مُشرک ہو جاتا ہے۔''

(تقویۃ الایمان، ص:۱۰)

ایک طرف دیوبندی مذہب کا یہ عقیدہ پڑھیے اور دوسری طرف نانوتوی صاحب کا وہ واقعہ پڑھیے۔

صاف عیاں ہوجائے گا کہ ان حضرات کے یہاں شرک کی ساری بحثیں صرف انبیا و اولیا کی حرمتوں سے کھیلنے کے لیے ہیں ورنہ ہر شرک اپنے گھر کے بزرگوں کے حق میں عین اسلام ہے۔

(۷)

عقیدۂ توحید کے ساتھ تصادم کا ایک اور واقعہ:

بات چل پڑی ہے تو عقیدۂ توحید کے ساتھ تصادم کا اب اس سے بھی زیادہ خوں ریز واقعہ ملاحظہ فرمایئے۔ مولوی اشرف علی صاحب تھانوی کے سوانح نگار خواجہ عزیز الحسن نے اپنی کتاب میں تھانوی صاحب کے احباب کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ واقعہ نقل کیا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:

”حضرت حافظ احمد حسین صاحب شاہجہاں پوری جو باوجود شاہجہاں پور کے بڑے رئیس ہونے کے صاحبِ سلسلہ بزرگ بھی تھے۔ ایک بار کسی کے لیے بددعا کی تو وہ شخص دفعۃً مرگیا۔ بجائے اس کے کہ اپنی اِس کرامت سے خوش ہوتے، ڈرے اور بذریعہ تحریر حضرت والا (تھانوی صاحب) سے مسئلہ پوچھا کہ مجھے قتل کا گناہ تو نہیں ہوا؟“

(اشرف السوانح، ج:۱، ص:۱۲۵)

تھانوی صاحب کا یہ ایمان شکن جواب دیدۂ حیرت سے پڑھنے کے قابل ہے تحریر فرمایا کہ:

”اگر آپ میں قوتِ تصرف ہے اور بددعا کرنے کے وقت آپ نے اس قوت سے کام لیا تھا۔ یعنی یہ خیال قصد اور قوت کے ساتھ کیا تھا کہ یہ شخص مرجائے تب تو قتل کا گناہ ہوا، اور چونکہ یہ قتل شبہِ عمد ہے اس لیے دیت اور کفارہ واجب ہوگا۔“

(اشرف السوانح، ج:۱، ص:۱۲۵)

اب اسی کے ساتھ دیوبندی مذہب کی بنیادی کتاب ”تقویۃ الایمان“ کی یہ عبارت پڑھیے۔ انبیا اور اولیا کی قوتِ تصرف پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اور اس بات کی ان میں کوئی بڑائی نہیں کہ اللہ نے ان کو عالم میں تصرف کرنے کی کچھ قدرت دی ہو کہ جس کو چاہیں مار ڈالیں۔“

(تقویۃ الایمان، ص:۲۵)

دیکھ رہے ہیں آپ؟ تصرف کی یہی قوت انبیا اور اولیا کے لیے تسلیم کرنا دیوبندی مذہب میں شرک ہے اور ان کے تئیں یہ شان صرف اللہ کی ہے۔ جو کسی کو ایسا تصرف ثابت کرے سو وہ مشرک ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ کیسی قیامت ہے کہ اسی شرک کو اپنے گلے کا ہار بنا لینے کے باوجود تھانوی صاحب اور ان کے متبعین روئے زمین کے سب سے بڑے توحید پرست کہلانے کے مدعی ہیں۔

(۸)

اپنے بزرگوں کے لیے ایک شرم ناک دعویٰ:

مولوی انوار الحسن ہاشمی مبلغ دار العلوم دیوبند نے ”مبشرات دار العلوم“ کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو دار العلوم کے محکمۂ نشر و اشاعت کی طرف سے شائع کی گئی ہے۔ کتاب کے پیشِ لفظ کا یہ حصہ خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

”بعض کامل الایمان بزرگوں کو جن کی عمر کا بیشتر حصہ تزکیۂ نفس اور روحانی تربیت میں گزرتا ہے، باطنی اور روحانی حیثیت سے ان کو منجانب اللہ ایسا ملکۂ راسخہ حاصل ہوجاتا ہے کہ خواب یا بیداری میں ان پر وہ امور ”خود بخود“ منکشف ہوجاتے ہیں جو دوسروں کی نظروں سے پوشیدہ ہیں۔“

(مبشرات دار العلوم، ص:۱۲)

لیکن غیرتِ اسلامی کو آواز دیجیے کہ کشف کا یہی ملکۂ راسخہ جو دیوبند کے کامل الایمان

بزرگوں کو تزکیۂ نفس کی بدولت حاصل ہوجاتا ہے اور جس کے ذریعے مخفی امور ان پر خود بخود منکشف ہوجایا کرتے ہیں۔ وہ رسولِ اکرم ﷺ کے حق میں یہ حضرات تسلیم نہیں کرتے۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تصوف کی مستند کتابوں میں جب امت کے بعض اولیا کے لیے کشف کا ثبوت ملتا ہے تو روے زمین کے علم کے سلسلے میں اگر سردارِ انبیا و اولیا حضور اکرم ﷺ کے لیے بھی کشف مان لیا جائے تو کیا قیامت لازم آتی ہے؟ تو اس کا جواب یوں عنایت فرماتے ہیں:

''ان اولیاء کو حق تعالیٰ نے کشف کردیا کہ ان کو یہ حضور علم حاصل ہوگیا۔ اگر اپنے فخرِ عالم علیہ السلام کو بھی لاکھ گونہ اس سے زیادہ عطا فرمادے ممکن ہے۔ مگر ثبوت فعلی اس کا کہ عطا کیا کس (دلیل) سے ثابت ہے کہ اس پر عقیدہ کیا جاوے''

(براہینِ قاطعہ، ص:۵۲)

گروہی پاسداری کے جذبے سے بالاتر ہوکر فیصلہ کیجیے کہ رسول الثقلین ﷺ کا کشف تو اللہ کی عطا پر موقوف رکھا گیا ہے۔ لیکن دیوبند کے کامل الایمان بزرگوں کو ریاضت اور تزکیۂ نفس کے بل پر یہ کشف خود بخود حاصل ہوجاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ حصولِ کشف کا ذریعہ اگر تزکیۂ نفس اور ریاضت ہی ہے جیسا کہ اوپر گزرا تو اس تفریق کی وجہ سوائے اس کے اور کیا ہوسکتی ہے کہ یہ حضرات اپنے بزرگوں کو ریاضت اور تزکیۂ نفس میں معاذ اللہ رسولِ اکرم ﷺ سے بھی افضل و برتر سمجھتے ہیں۔

پھر مذکورۂ بالا دونوں عبارتوں کو ایک ساتھ نظر میں رکھنے کے بعد ایک تیسرا سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اپنے بزرگوں کے حق میں ملکۂ راسخہ کے نام سے کشف کی ایک ایسی دائمی اور ہمہ وقتی قوت مان لی گئی جس کے بعد اب فرداً فرداً ایک ایک مخفی شئی کے علم کے ثبوت کی احتیاج ہی باقی نہیں رہ جاتی بلکہ تنہا یہی قوت سارے مخفیات کے انکشاف کے لیے کافی ہوجاتی ہے۔

لیکن برا ہو تنگیِ دل کا کہ علم و انکشاف کا یہی ملکۂ راسخہ رسولِ مجتبیٰ ﷺ کے حق میں تسلیم کرتے ہوئے ان حضرات کو شرک کا آزار ستانے لگتا ہے۔ یہاں فرداً فرداً ایک ایک شئی کے علم

کے بارے میں دلیل خاص کا مطالبہ کرتے ہیں کہ خدا نے عطا کیا ہو تو اس کا ثبوت پیش کیجیے۔ ذات نبوی کو منشا علم تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے قاری طیب صاحب لکھتے ہیں!!

''یہ صورت نہ تھی کہ آپ کو نبوت کے مقام رفیع پر پہنچا کر بیک دم اور اچانک ذات پاک نبوی کو منشاء علم بنا دیا گیا ہو اور ضرورتوں اور حوادث کے وقت ''خود بخود'' آپ کے اندر سے علم اُبھر آتا ہو۔''

(فاران: کراچی کا توحید نمبر، ص:۱۱۳)

یہ ''خود بخود'' گھر کے بزرگوں کے لیے بھی تھا اور ''خود بخود'' یہاں بھی ہے لیکن وہاں علمی رتبہ بڑھانے کے لیے تھا یہاں گھٹانے کے لیے ہے۔

اب آپ ہی انصاف سے کہیے کہ زاویۂ نگاہ کا یہ فرق کیا اس غبارِ خاطر کا پتہ نہیں دیتا جو کسی کے دل میں کسی کی طرف سے پیدا ہوجانے کے بعد اعترافِ حقیقت کی راہ میں دیوار بن کر حائل ہوجاتا ہے۔

لگاتار غیبی مشاہدات:

اب ذیل میں دارالعلوم دیوبند کے کامل الایمان بزرگوں کی غیب دانی سے متعلق وہ واقعات ملاحظہ فرمایئے جن کی تشہیر کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔

دارالعلوم دیوبند کی ایک عمارت کے متعلق مولوی رفیع الدین صاحب سابق مہتمم کا یہ کشف بیان کیا گیا ہے کہ:

''حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے اپنے کشف سے معلوم کرکے ارشاد فرمایا کہ نودرے کی وسطی درسگاہ سے عرشِ معلیٰ تک میں نے نور کا ایک سلسلہ دیکھا ہے۔''

(مبشرات، ص:۳۱)

اب دیوبند کے قبرستان کے متعلق ایک دوسرا کشف ملاحظہ فرمایئے:

''حظیرۂ قدسیہ یا خطۂ صالحین یعنی جس قبرستان میں حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، فخر الہند حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مفتی اعظم حضرت مولانا عزیز الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور سیکڑوں علما وطلبہ مدفون ہیں، اس حصّے کے متعلق شاہ رفیع الدین صاحب کا کشف تھا کہ اس حصّے میں مدفون ہونے والا انشاء اللہ مغفور ہوگا۔''

(مبشرات، ص:۳۱)

واضح رہے کہ ''انشاء اللہ'' کی یہ قید محض سخن تکیہ کے طور پر ہے ورنہ انشاء اللہ کی قید کے ساتھ تو ہر قبرستان کا مدفون مغفرت یافتہ ہے۔ پھر دیوبندی قبرستان کے متعلق کشف کی خصوصیت کیا رہی۔

اب اخیر میں مولوی قاسم صاحب نانوتوی کی قبر کے متعلق ایک عجیب وغریب کشف ملاحظہ فرمایئے:

''حضرت مولانا رفیع الدین صاحب مجددی نقشبندی سابق مہتمم دارالعلوم کا مکاشفہ ہے کہ حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند کی قبر، عین کسی نبی کی قبر میں ہے۔''

(مبشرات، ص:۳۶)

سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کشف سے موصوف کی کیا مراد ہے؟ کیا دیوبند میں کسی نبی کی قبر پہلے سے موجود تھی جسے خالی کرایا گیا اور نانوتوی صاحب کو وہاں دفن کیا گیا۔ اگر ایسا ہے تو اس نبی کی قبر کی نشاندہی کس نے کی؟ اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اس کشف سے موصوف کی کیا مراد ہے؟

اگر لفظوں کے الٹ پھیر سے صرفِ نظر کرلیا جائے تو ہوسکتا ہے کہ غیر واضح الفاظ میں وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ نانوتوی صاحب کی قبر عین کسی نبی کی قبر ہے اور یہی زیادہ قرینِ قیاس بھی معلوم ہوتا ہے کیوں کہ نانوتوی صاحب کے حق میں اگرچہ کھُل کر نبوت کا دعویٰ نہیں کیا گیا ہے لیکن دبی زبان سے یہ روایت ضرور نقل کی گئی ہے کہ ان پر کبھی کبھی نزولِ وحی کی کیفیت طاری ہوتی تھی۔

جیسا کہ گیلانی صاحب نے اپنی کتاب سوانح قاسمی میں لکھا ہے کہ ایک دن مولانا نانوتوی نے اپنے پیرومرشد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب سے شکایت کی کہ: [1]

''جہاں تسبیح لے کر بیٹھا بس ایک مصیبت ہوتی ہے۔ اس قدر گرانی کہ جیسے سَو سَو مَن کے پتھر کسی نے رکھ دیئے ہوں۔ زبان وقلب سب بستہ ہوجاتے ہیں۔''

(سوانح قاسمی، ج:۱، ص:۲۵۸)

اس شکایت کا جواب حاجی صاحب کی زبانی یہ نقل کیا گیا ہے:

''یہ نبوت کا آپ کے قلب پر فیضان ہوتا ہے۔ اور یہ وہ ثقل (گرانی) ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے وقت محسوس ہوتا تھا تم سے حق تعالیٰ کو وہ کام لینا ہے جو نبیوں سے لیا جاتا ہے۔''

(سوانح قاسمی، ج:۱، ص:۲۵۹)

نبوت کا فیضان، وحی کی گرانی اور کار انبیا کی سپردگی، ان سارے لوازمات کے بعد نہ بھی صریح لفظوں میں ادّعائے نبوت کیا جائے جب بھی اصل مدعا اپنی جگہ پر ہے۔

اس کتاب کا پہلا باب جو بانی دارالعلوم دیوبند مولوی قاسم صاحب نانوتوی کے واقعات وحالات پر مشتمل تھا، یہاں پہنچ کر تمام ہوگیا۔

جس تصویر کا پہلا رُخ کتاب کے ابتدائی حصّے میں آپ کی نظر سے گزر چکا ہے یہ اس کا دوسرا رُخ تھا۔ اب چند لمحے کی فرصت نکال کر ذرا دونوں رُخوں کا موازنہ کیجیے اور انصاف ودیانت کے ساتھ فیصلہ دیجیے کہ تصویر کے پہلے رُخ میں جن عقائد ومسائل کو ان حضرات نے شرک قرار دیا تھا۔ جب ان ہی عقائد ومسائل کو تصویر کے دوسرے رُخ میں انھوں نے سینے سے لگالیا تو اب کس منہ سے وہ اپنے آپ کو موحد اور دوسروں کو مشرک قرار دیتے ہیں۔

دنیا کی تاریخ میں دوسروں کو جھٹلانے کی ایک سے ایک مثال ملتی ہے۔ لیکن اپنے آپ کو جھٹلانے کی اس سے زیادہ شرم ناک مثال اور کہیں نہ مل سکے گی۔

طرفہ تماشا یہ کہ عقیدۂ توحید کے ساتھ تصادم کے یہ واقعات صرف مولوی قاسم صاحب

نانوتوی ہی تک محدود نہیں ہیں کہ اسے حسن اتفاق پر محمول کرلیا جائے بلکہ دیوبندی جماعت کے جتنے بھی مشاہیر ہیں کم وبیش سبھی اس الزام میں ملوث نظر آتے ہیں جیسا کہ آئندہ اوراق میں آپ پڑھ کے حیران وششدر رہ جائیں گے۔

★★★--------------★★★--------------★★★

دوسرا باب

دیوبندی جماعت کے مذہبی پیشوا جناب
مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی
کے بیان میں

اس باب میں پیشوائے دیوبند مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی کے متعلق دیوبندی لٹریچر سے ایسے واقعات و حقائق جمع کیے گئے ہیں جن میں عقیدۂ توحید سے تصادم، اصولوں سے انحراف، مذہبی خودکشی اور منہ بولے شرک کو اپنے حق میں ایمان واسلام بنا لینے کی حیرت انگیز مثالیں ورق ورق پر بکھری ہوئی ہیں۔ انھیں چشمِ حیرت سے پڑھیے اور ضمیر کا فیصلہ سننے کے لیے گوش برآواز رہیے!

سلسلۂ واقعات

(۱)

غیب دانی اور دلوں کے خطرات پر مطلع ہونے کے آٹھ واقعات

دیوبندی مذہب کے سرگرم حامی مولوی عاشق الٰہی میرٹھی نے تذکرۃ الرشید کے نام سے دو جلدوں میں مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی کی سوانح حیات لکھی ہے ذیل کے اکثر واقعات ان ہی کی کتاب سے اخذ کیے گئے ہیں۔

دلوں کے خطرات پر مطلع ہونے اور مخفی امور کے مشاہدات سے متعلق اب ذیل میں واقعات کا سلسلہ ملاحظہ فرمائیے:

پہلا واقعہ

ولی محمد نام کا ایک طالب علم جو مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی کی خانقاہ میں پڑھتا تھا اس کے متعلق تذکرۃ الرشید کے مصنف یہ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ:

''ایک بار مکان سے خرچ آنے میں دیر ہوئی اور ان کو ایک یا دو فاقہ کی نوبت آپہنچی۔ مگر نہ انھوں نے کسی سے ذکر کیا نہ کسی صورت یہ حال کسی پر ظاہر ہوا، اسی حالت میں صبح کے وقت بغل میں کتاب دبائے پڑھنے کے واسطے حضرت کی خدمت میں آرہے تھے کہ راستہ میں حلوائی کی دوکان پر حلوا پک رہا تھا۔ یہ کچھ دیر وہاں کھڑے رہے کہ کچھ پاس ہو تو کھائیں مگر پیسہ بھی نہ تھا اس لیے صبر کر کے

چل دیے اور خانقاہ میں پہنچے۔ حضرت گویا ان کے منتظر ہی بیٹھے تھے۔ سلام کا جواب دیتے ہی فرمایا۔ مولوی ولی محمد! آج تو حلوا کھانے کو ہمارا جی چاہتا ہے لو یہ چار آنہ لے جاؤ اور جس دوکان سے تم کو پسند ہے وہیں سے لائیو۔ غرض مولوی ولی محمد اسی دوکان سے حلوا خرید کر لائے اور حضرت کے سامنے رکھ دیا۔ حضرت نے ارشاد فرمایا میاں ولی محمد! میری خوشی یہ ہے کہ اس حلوے کو تم ہی کھالو۔''

(تذکرۃ الرشید، ج:۲، ص:۲۲۷)

یہاں تک تو واقعہ تھا جس میں حسنِ اتفاق کو بھی دخل ہو سکتا ہے۔ لیکن گنگوہی صاحب کی ہمہ وقتی غیب دانی کے متعلق ذرا اسی طالبِ علم کے یہ تأثرات ملاحظہ فرمائیے لکھتے ہیں کہ:

''مولوی ولی محمد اس قصے کے بعد فرمایا کرتے تھے کہ حضرت کے سامنے جاتے مجھے بہت ڈر معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ قلب کے وساوِس (وسوسے) اختیار میں نہیں اور حضرت ان پر مطلع ہو جاتے ہیں۔''

(تذکرۃ الرشید، ج:۲، ص:۲۲۷)

مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ دلوں کے خطرات سے باخبر ہونے کی یہ کیفیت اتفاقی نہیں بلکہ دائمی تھی۔ یعنی حواس پنج گانہ کی طرح وہ ہر وقت اس قوت سے کام لینے پر قادر تھے۔

اپنے گھر کے بزرگوں کی غیب دانی کا تو یہ حال بیان کیا جاتا ہے لیکن انبیا و اولیا کی جناب میں ان حضرات کے عقیدے کی عام زبان یہ ہے:

''(جو کوئی کسی کے متعلق یہ سمجھے کہ) جو بات میرے منہ سے نکلتی ہے وہ سب سُن لیتا ہے اور جو خیال و وہم اس کے دل میں گزرتا ہے وہ سب سے واقف ہے سو ان باتوں سے مشرک ہو جاتا ہے۔ اور اس قسم کی باتیں سب شرک ہیں۔''

(تقویۃ الایمان، ص:۱۰)

اب اس بے انصافی کا شکوہ کس سے کیا جائے کہ ایک ہی عقیدہ جو انبیا و اولیا کے بارے میں شرک ہے وہی گھر کے بزرگوں کے حق میں اسلام و ایمان بن گیا ہے۔

کیا اب بھی حق و باطل کی راہوں کا امتیاز محسوس کرنے کے لیے مزید کسی نشانی کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ اپنے ضمیر کی آواز پر فیصلہ کیجیے!

دوسرا واقعہ

دلوں کے خطرات پر مطلع ہونے کا ایک اور واقعہ سنیے۔ لکھتے ہیں کہ:

''ایک مرتبہ استاذی مولانا عبدالمومن صاحب حاضر خدمت تھے دل میں وسوسہ گزرا کہ بزرگوں کے حالات میں زہد اور فقر و تنگ دستی غالب دیکھی گئی ہے اور حضرت کے جسم مبارک پر جو لباس ہے گو مباح و مشروع ہے مگر بیش قیمت ہے۔

حضرت امام ربانی (مولانا گنگوہی) اس وقت کسی سے باتیں کر رہے تھے دفعتاً ادھر متوجہ ہو کر فرمایا کہ عرصہ ہوا مجھے کپڑے بنانے کا اتفاق نہیں ہوتا لوگ خود بنا بنا کر بھیج دیتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں کہ تو ہی پہننا، ان کی خاطر سے پہنتا ہوں، چنانچہ بدن پر اس وقت جتنے کپڑے ہیں سب دوسروں کے ہیں۔''

(تذکرۃ الرشید، ج:۲، ص:۱۷۳)

اس واقعہ کا یہ رُخ خاص طور پر محسوس کرنے کے قابل ہے کہ دل کے اس خطرے پر مطلع ہونے کے لیے اُنھیں کسی خاص توجہ کی بھی ضرورت نہیں پیش آئی دوسرے شخص کے ساتھ گفتگو میں مشغول ہوتے ہوئے بھی وہ مولوی عبدالمومن صاحب کے دل کے وسوسے سے باخبر ہو گئے۔ اس واقعہ سے ان کی ہمہ جہتی آگہی کا پتہ چلتا ہے، اور میرا خیال اگر غلط نہیں ہے تو یہ شان صرف خدا کی ہے کیوں کہ انسان کے بارے میں تو ہمیشہ یہی تصور رہا ہے کہ اس کی قوت ادراک ایک وقت میں ایک ہی طرف متوجہ ہو سکتی ہے۔

اب چشمِ عبرت سے لہو ٹپکنے کی بات یہ ہے کہ دیوبندی حضرات کے امام ربانی تو بغیر کسی

خاص توجہ کے بھی فی الفور دلوں کے مخفی حال پر مطلع ہو گئے۔ لیکن امام الانبیا ﷺ کے متعلق ان حضرات کے عقیدے کی زبان یہ ہے:

''بہت سے امور میں آپ کا خاص اہتمام سے توجہ فرمانا بلکہ فکر و پریشانی میں واقع ہونا اور باوجود اس کے پھر مخفی رہنا ثابت ہے۔''

(حفظ الایمان، ص:۷)

اب آپ ہی فیصلہ کیجیے! یہ سر پیٹ لینے کی بات ہے یا نہیں کہ غیبی ادراک کی جو قوت ان حضرات کے نزدیک ایک ادنیٰ اُمتی کے لیے ثابت ہے وہ خدا کے محبوب پیغمبر امام الانبیا ﷺ کے لیے ثابت نہیں ہے۔ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَار

تیسرا واقعہ

لکھتے ہیں کہ:

''مولوی نظر محمد خاں صاحب فرماتے ہیں کہ میری اہلیہ جس وقت آپ سے بیعت ہوئیں تو چونکہ مجھے طبعی طور پر غیرت زیادہ تھی اس لیے عورت کا باہر آنا یا کسی اجنبی مرد کو آواز سنانا بھی گوارا نہ تھا اس وقت یہ وسوسہ ذہن میں آیا کہ حضرت میری اہلیہ کی آواز سُنیں گے مگر یہ حضرت کی کرامت تھی کہ کشف سے میرے دل کا وسوسہ دریافت کر لیا اور یوں فرمایا کہ اچھا! مکان کے اندر بٹھلا کر کواڑ بند کر دو۔''

(تذکرۃ الرشید، ج:۲، ص:۵۴)

اس واقعے کے اندر بالکل صراحت ہے اس امر کی کہ گنگوہی صاحب نے ان کے دل کا یہ وسوسہ الہام خداوندی کے ذریعے نہیں بلکہ اپنی قوت کشف کے ذریعے دریافت فرمالیا ہے لیکن صد حیف کہ یہی قوتِ کشف پیغمبر اعظم ﷺ کے حق میں تسلیم کرتے ہوئے ان حضرات کو شرک کا آزار ستانے لگتا ہے۔ اور دیوانوں کی طرح شور مچانے لگتے ہیں کہ یہ تو خدا کے ساتھ برابری ہو گئی۔ ایک پیغمبر کو خدا کا منصب دے دیا گیا!

چوتھا واقعہ

لکھتے ہیں کہ:

''مولانا علی رضا صاحب حضرت کے شاگرد ہیں۔ فرماتے ہیں زمانہ طالب علمی میں مجھے ایسا مرض لاحق ہوا کہ وضو قائم نہ رہتا تھا۔ بعض نماز کے لیے تو کئی کئی بار وضو کرنا پڑتا تھا۔

ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ فجر کی نماز کو بندہ مسجد میں سویرے آگیا۔ سردی کا موسم تھا اور اس دن اتفاق سے جاڑا بھی زیادہ تھا بار بار وضو کرنے میں بہت تکلیف ہوتی تھی، جی چاہتا تھا کہ کسی طرح جلد نماز سے فراغت ہوجائے۔ تقدیری بات کہ امام ربانی نے اس دن معمول سے بھی کچھ زیادہ دیر لگائی۔ کئی مرتبہ سخت سردی میں وضو کرنے سے پریشان ہوا اور وسوسہ گزرا کہ ایسی بھی کیا حنفیت ہے؟ حضرت ابھی اسفار (اُجالے) ہی کے منتظر ہیں اور ہم وضو کرتے کرتے مرے جاتے ہیں لحظہ دو لحظہ کے ہی بعد حضرت تشریف لائے اور جماعت کھڑی ہوگئی۔ فراغت کے بعد حسب معمول دیگر اشخاص کے ہمراہ میں بھی حضرت کے پیچھے پیچھے حجرہ شریفہ تک گیا۔ جب سب لوگ لوٹ گئے اور حضرت نے دروازہ بند کرنا چاہا تو مجھے پاس بلا کر ارشاد فرمایا، ''بھائی! یہاں کے لوگ نماز فجر کے واسطے تاخیر کرکے آتے ہیں اس وجہ سے میں بھی دیر کردیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر حضرت حجرہ میں تشریف لے گئے اور میں ندامت سے پسینہ پسینہ ہوگیا۔''

(تذکرۃ الرشید، ج:۲، ص:۲۴۴)

اس لیے کہ غیب داں شخص پر دل کی چوری کھل گئی۔ ورنہ آپ ہی بتائیے کہ دل کے وسوسے کے سوا شیخ کی بارگاہ کا اور کوئی دوسرا جرم ہی کیا تھا؟

پانچواں واقعہ

لکھتے ہیں کہ:

''ایک مرتبہ مولوی (ولایت حسین) صاحب کو وسوسہ ہوا کہ حضرت مجدد صاحب اپنے بعض مکتوبات میں ذکر جہر کو بدعت فرماتے ہیں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان ہی کو مخاطب بنا کر حضرت نے ارشاد فرمایا ذکر جہر کی اجازت بعض وقت حضرات نقشبندیہ بھی دے دیتے ہیں۔''

(تذکرۃ الرشید، ج:۲، ص:۲۲۹)

دیکھ رہے ہیں آپ! لگاتار دل کے وسوسوں پر مطلع ہونے کی یہ شان! ادھر خیال گزرا اُدھر باخبر۔ لیکن ان حضرات کی بنیادی کتاب ''تقویۃ الایمان'' کے حوالے سے ابھی آپ پڑھ چکے ہیں کہ یہ شان صرف خدا کی ہے۔ جو غیر خدا کے لیے اس طرح کی باتیں ثابت کرتا ہے وہ مشرک ہوجاتا ہے۔

اب اس الزام کا جواب ہمارے سر نہیں ہے کہ ایک ہی عقیدہ جو غیر خدا کے حق میں شرک تھا وہ گھر کے بزرگوں کے حق میں اسلام کیوں کر بن گیا؟

چھٹا واقعہ

یہاں تک تو دلوں کے خطرات پر مطلع ہونے کی بات تھی اب عام طور غیب دانی کی شان ملاحظہ فرمائیے۔ لکھتے ہیں کہ:

''ایک مرتبہ دو شخص اجنبی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام و مصافحہ کے بعد بیعت کی تمنا ظاہر کی۔ آپ نے فرمایا دو (۲) رکعت پڑھو۔ حضرت کے اس ارشاد پر تھوڑی دیر تو دونوں صاحب گردن جھکائے بیٹھے رہے۔ پھر چپکے ہی سے اُٹھ کر چل دیے۔

جب دروازہ سے باہر ہوئے تو تب حضرت نے فرمایا۔ ''دونوں شیعہ تھے، میرا

امتحان لینے آئے تھے۔" حاضرین میں سے بعض آدمی اس کی تحقیق کو ان کے پیچھے گئے اور معلوم کیا تو وہ واقع میں رافضی تھے۔"

(تذکرۃ الرشید، ج:۲، ص:۲۲۷)

ساتواں واقعہ

"ارواحِ ثلثہ" کے مصنف امیر شاہ خان اپنی کتاب میں مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی کے متعلق یہ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ:

"حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے مولوی محمد یحییٰ صاحب کاندھلوی سے فرمایا کہ فلاں مسئلہ شامی میں دیکھو۔ مولوی صاحب نے عرض کیا کہ حضرت وہ مسئلہ شامی میں تو ہے نہیں۔ فرمایا یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ لاؤ شامی اُٹھالاؤ!! شامی لائی گئی۔ حضرت اس وقت آنکھوں سے معذور ہوچکے تھے۔ شامی کے دو ثلث (دو تہائی) اوراق دائیں جانب کرکے اور ایک ثلث (ایک تہائی) بائیں جانب کرکے انداز سے ایک دم کتاب کھولی اور فرمایا کہ بائیں طرف کے صفحے پر نیچے کی جانب دیکھو۔ دیکھا تو وہ مسئلہ اسی صفحہ میں موجود تھا۔ سب کو حیرت ہوئی۔ حضرت نے فرمایا کہ حق تعالیٰ نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ میری زبان سے غلط نہیں نکلوائے گا۔"

(ارواحِ ثلثہ، ص:۲۹۲)

اب اس واقعے پر جناب مولوی اشرف علی صاحب تھانوی کا ایک حاشیہ پڑھیے۔ لکھتے ہیں:

"وہی مقام نکل آنا گو اتفاقاً بھی ہوسکتا ہے۔ مگر قرائن سے یہ باب کشف سے معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ جزم کے ساتھ نہ فرماتے کہ فلاں موقع پر دیکھو۔"

(حاشیہ ارواحِ ثلثہ، ص:۲۹۲)

ذرا غور فرمایئے! یہ واقعہ کوئی چیستاں تو تھا نہیں جس کے حل کے لیے حاشیہ چڑھانے کی ضرورت

تھی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تھانوی صاحب نے خیال کیا ہوگا کہ لوگ کہیں اسے حسنِ اتفاق ہی پر محمول نہ کرلیں اس لیے "باب کشف" سے کہہ کر لوگوں کی توجہ ان کی "غیب دانی" کی طرف مبذول کرادی۔

اس واقعے میں گنگوہی صاحب کے اس جملے پر کہ "حق تعالیٰ نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ میری زبان سے غلط نہیں نکلوائے گا۔" کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

پہلا سوال تو یہ ہے کہ خدا کے ساتھ اُنھیں ہم کلامی کا شرف کب اور کہاں حاصل ہوا کہ اس نے ان سے یہ وعدہ فرمایا؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا جزم و یقین کے ساتھ یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ گنگوہی صاحب کی زبان و قلم سے ساری عمر کوئی غلط بات نہیں نکلی؟ ایک نبی کے بارے میں تو البتہ ایسا سوچنا صحیح ہے لیکن میں یقین کرتا ہوں کہ بڑے سے بڑا اُمتی بھی زبان و قلم کی لغزشوں سے معصوم نہیں قرار دیا جاسکتا۔

پس ایسی حالت میں کیا بالفاظ دیگر وہ خدائے قدوس کی طرف یہ الزام نہیں منسوب کر رہے ہیں کہ اس نے معاذ اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی کی۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ اس اعلان سے آخر گنگوہی صاحب کا مدعا کیا ہے؟ کافی غور و فکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اُنہوں نے عام لوگوں کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ خدا کے یہاں ان کا مقام "بشریت" کی سطح سے بھی اونچا ہے۔ کیونکہ نبی بھی اگرچہ بشر ہی ہوتے ہیں۔ لیکن دیوبندی حضرات کے تئیں ان سے بھی غلطی واقع ہوسکتی ہے جیسا کہ تھانوی صاحب اپنے فتاویٰ میں ارشاد فرماتے ہیں:

"تحقیق کی غلطی ولایت بلکہ نبوت کے ساتھ بھی جمع ہوسکتی ہے۔"

(فتاویٰ امدادیہ، ج:۲، ص:۹۴)

اب اس مقام پر میں آپ کو ایک سخت قسم کے امتحان میں مبتلا کرکے آگے بڑھتا ہوں۔ یہ فیصلہ کرنا اب آپ ہی کی غیرت ایمانی کا فریضہ ہے کہ اپنے پیغمبر کے ساتھ وفاداری کا شیوہ کیا ہے؟ خدا

کرے فیصلہ کرتے وقت آپ کا دل کسی غلط جذبۂ پاسداری کا شکار نہ ہو۔

آٹھواں واقعہ

یہی 'ارواحِ ثلٰثہ' کے مصنف امیر شاہ خاں گنگوہی صاحب کے متعلق اس واقعے کے بھی راوی ہیں۔ بیان کرتے ہیں کہ:

"ایک دفعہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جوش میں تھے اور تصورِ شیخ کا مسئلہ در پیش تھا۔ فرمایا کہہ دوں؟ عرض کیا گیا کہ فرمایئے! پھر فرمایا کہہ دوں؟ عرض کیا گیا فرمایئے! پھر فرمایا کہہ دوں؟ عرض کیا گیا کہ فرمایئے! تو فرمایا، تین سال کامل حضرت امداد کا چہرہ میرے قلب میں رہا اور میں نے ان سے پوچھے بغیر کوئی کام نہیں کیا۔ پھر اور جوش آیا، فرمایا کہہ دوں؟ عرض کیا گیا کہ حضرت ضرور فرمایئے! فرمایا کہ اتنے سال حضرت صلی اللہ علیہ وسلم میرے قلب میں رہے اور میں نے کوئی بات بغیر آپ کے پوچھے نہیں کی۔ یہ کہہ کر اور جوش ہوا، فرمایا کہہ دوں؟ عرض کیا گیا کہ فرمایئے! مگر خاموش ہوگئے۔ لوگوں نے اصرار کیا تو فرمایا کہ بس رہنے دو۔"

(ارواحِ ثلٰثہ، ص:۲۹۲)

یعنی معاذ اللہ! اب خدا کا چہرہ دل میں تھا۔۔۔!

واضح رہے کہ یہاں بات مجاز واستعارے کی زبان میں نہیں ہے جو کچھ کہا گیا ہے وہ قطعاً اپنے ظاہر پر محمول ہے۔ اس لیے کہنے دیا جائے کہ یہاں حضور اکرم ﷺ سے مراد حضور اکرم کا نور نہیں ہے بلکہ حضور سے خود حضور ہی مراد ہیں کیوں کہ نور ایک جوہرِ لطیف کا نام ہے اس کے ساتھ ہم کلام ہونے کے کوئی معنی ہی نہیں۔

اب اہلِ نظر کے لیے یہاں قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ بات اپنی فضیلت و بزرگی کی آگئی ہے تو سارے محالات ممکن ہی نہیں بلکہ واقع ہوگئے ہیں۔ اب یہاں کسی طرف سے یہ سوال نہیں اُٹھتا کہ معاذ اللہ جتنے دنوں تک حضور آپ کے دل میں مقیم رہے اُتنے دنوں تک وہ اپنی تربتِ پاک

میں موجود تھے یا نہیں؟ اگر نہیں تھے تو کیا اتنے دنوں تک تربتِ پاک خالی پڑی رہی اور اگر موجود تھے تو پھر تھانوی صاحب کے اس سوال کا کیا جواب ہوگا جو اُنھوں نے محافلِ میلاد میں حضور اکرم ﷺ کی تشریف آوری کے سوال پر اُٹھایا ہے کہ:

"اگر ایک وقت میں کئی جگہ محفل منعقد ہو تو آیا سب جگہ آپ تشریف لے جاویں گے یا کہیں؟ یہ تو ترجیح بلا مرجّح ہے کہ کہیں جاویں کہیں نہ جاویں۔ اور اگر سب جگہ جاویں تو وجود آپ کا واحد ہے، ہزار جگہ کس طور جا سکتے ہیں؟"

(فتاویٰ امدادیہ، ج:۴، ص:۵۸)

زاویۂ نگاہ کا یہ فرق کسی حال میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اپنی روحانی برتری اور غیبی قوتِ ادراک کے سوال پر ذہن کے بھرپور اعتراف کے ساتھ سب خاموش رہے اور جب بات محبوبِ کردگار کی آگئی تو عقلِ فتنہ پرور نے ایسی ایسی بال کی کھال نکالی کہ آدمی کا یقین واعتماد گھائل ہو کے رہ گیا۔ اگر انصاف کا جذبہ شریکِ نظر رہا تو دیو بندی حضرات کا یہ مخصوص اندازِ فکر آپ اس کتاب میں جگہ جگہ محسوس کریں گے۔ اور گنگوہی صاحب کے اس واقعے کا ایک رُخ تو اتنا اشتعال انگیز ہے کہ سوچتا ہوں تو آنکھوں سے خون ٹپکنے لگتا ہے یہ کہہ کر کہ کوئی کام اُنھوں نے حضور ﷺ سے پوچھے بغیر نہیں کیا، دوسرے لفظوں میں اپنے جسم و جوارح اور زبان و قلم کی ساری تقصیرات (کوتاہیوں) کو اُنھوں نے حضور ﷺ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ کیونکہ یہ دعویٰ ہرگز ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ ان ایّام میں ان سے کوئی خلافِ شرع کام صادر نہیں ہوا اور جب ہوا تو اُنہی کے بیان کے مطابق ماننا پڑے گا کہ معاذ اللہ وہ خلافِ شرع کام بھی اُنھوں نے حضور کے ایما سے کیا۔

چند اور عبرت انگیز کہانیاں:

آپ کی نگاہوں پر بار نہ ہو تو تذکرۃ الرشید میں گنگوہی صاحب سے متعلق مشرکانہ اختیارات اور پیغمبرانہ تعلّیوں کی جو کہانیاں نقل کی گئی ہیں ان میں سے دو چار کہانیاں نمونے کے طور پر ملاحظہ فرمائیں:

پہلی کہانی

تذکرۃ الرشید کے مُصنف بیان کرتے ہیں کہ بارہا آپ کو اپنی زبان فیض ترجمان سے یہ کہتے سنا گیا:

''سن لو حق وہی ہے جو رشید احمد کی زبان سے نکلتا ہے۔ اور بقسم کہتا ہوں کہ میں کچھ نہیں ہوں مگر اس زمانہ میں ہدایت و نجات موقوف ہے میرے اتباع پر۔''

(تذکرۃ الرشید، ج:۲، ص:۱۷)

پاسداری کے جذبے سے الگ ہو کر صرف ایک لمحے کے لیے سوچیے! وہ یہ نہیں کہہ رہے ہیں کہ رشید احمد صاحب کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہے وہ حق ہے، بلکہ ان کے جملے کا مفہوم یہ ہے کہ حق صرف رشید احمد ہی کی زبان سے نکلتا ہے۔ دونوں کا فرق یوں محسوس کیجیے کہ پہلے جملے کو صرف خلاف واقعہ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن دوسرا جملہ تو خلاف واقعہ ہونے کے ساتھ ساتھ اُس دور کے تمام پیشوایانِ اسلام کی حق گوئی کو ایک کھلا ہوا چیلنج بھی ہے یعنی مطلب یہ ہے کہ اُس زمانے میں مولوی رشید احمد صاحب کے علاوہ کسی کی زبان بھی کلمۂ حق سے آشنا نہیں ہوئی۔

افسوس کہ گنگوہی صاحب کے اس دعوے کو مُشتہر کرتے ہوئے دیوبندی علما نے قطعاً یہ محسوس نہیں کیا کہ اس میں دوسرے حق پرست علما کی کتنی صریح توہین موجود ہے۔

اور اخیر کا یہ جملہ کہ ''اس زمانے میں ہدایت و نجات موقوف ہے میرے اتباع پر'' پہلے والے سے بھی زیادہ خطرناک اور گمراہ کن ہے۔ گویا حصولِ نجات کے لیے اب رسولِ عربی **فداہ ابی و اُمی** کا اتباع ناکافی ہے۔

اور سوچنے کی بات یہ ہے کہ کسی کے اتباع پر نجات موقوف ہو، یہ شان صرف رسول کی ہو سکتی ہے، نائبِ رسول ہونے کی حیثیت سے علمائے کرام کا منصب صرف یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اتباعِ رسول کی دعوت دیں۔ اپنے اتباع کی دعوت دینا قطعاً ان کا منصب نہیں ہے۔ لیکن صاف عیاں ہے کہ گنگوہی صاحب اس منصب پر قناعت نہیں کرنا چاہتے۔

پھر ایک طرف تو گنگوہی صاحب اپنے اتباع کی دعوت دے کر لوگوں سے اپنا حکم اور اپنی راہ و رسم منوانا چاہتے ہیں اور دوسری طرف ان کے مذہب کی بنیادی کتاب[1] 'تقویۃ الایمان' کا فرمان یہ ہے:

''کسی کی راہ و رسم کو ماننا اور اُس کے کلمہ کو اپنی سند سمجھنا، یہ بھی ان ہی باتوں میں سے ہے کہ خاص اللہ تعالیٰ نے اپنی تعظیم کے واسطے ٹھہرائے ہیں، پھر جو کوئی یہ معاملہ کسی مخلوق سے کرے تو اس پر بھی شرک ثابت ہوتا ہے۔''

(تقویۃ الایمان)

اب اس الزام کا جواب ہمارے سر نہیں کہ جو معاملہ کسی مخلوق کے ساتھ شرک تھا وہی گنگوہی صاحب کے ساتھ اچانک کیوں کر مدارِ نجات بن گیا۔۔۔؟ کہیں نجات کا دروازہ بند اور کہیں اس کے بغیر نجات ہی نہ ہو۔ آخر یہ معمّہ کیا ہے؟

دوسری کہانی

تذکرۃ الرشید کے مصنف لکھتے ہیں کہ:

''مولوی عبدالسبحان صاحب انسپکٹر پولیس ضلع گوالیار فرماتے ہیں کہ مولوی محمد قاسم صاحب کمشنر بندوبست ریاست گوالیار ایک بار پریشانی میں مبتلا ہوئے اور ریاست کی طرف سے تین لاکھ روپے کا مطالبہ ہوا۔ ان کے بھائی یہ خبر پا کر حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں گنج مرادآباد پہنچے۔ حضرت مولانا نے وطن دریافت کیا، اُنھوں نے عرض کیا دیوبند، مولانا نے تعجب کے ساتھ فرمایا، گنگوہ حضرت مولانا کی خدمت میں قریب تر کیوں نہ گئے اتنا دراز سفر کیوں اختیار کیا؟

اُنھوں نے عرض کیا کہ حضرت یہاں مجھے عقیدت لائی ہے۔ مولانا نے ارشاد فرمایا، تم گنگوہ ہی جاؤ، تمہاری مشکل کشائی حضرت مولانا رشید احمد صاحب ہی کی

دعاء پر موقوف ہے اور تمام روئے زمین کے اولیاء بھی اگر دعا کریں گے تو نفع نہ ہوگا۔"

(تذکرۃ الرشید، ج:۲، ص:۲۱۵)

بات اپنے شیخ کی فضیلت و برتری کی آگئی ہے تو اب یہاں کوئی سوال نہیں اُٹھتا کہ مولانا فضل الرحمٰن صاحب کو پردۂ غیب کا یہ راز کیوں کر معلوم ہو گیا کہ مشکل کشائی صرف مولوی رشید احمد ہی کی دعا پر موقوف ہے اور کس علم کے ذریعے انھوں نے تمام روے زمین کے اولیا کی دعاوں کا فرداً فرداً وہ انجام معلوم کرلیا جس کا تعلق صرف خدا کی ذات کے ساتھ ہے اور وہ بھی اتنا جھٹ پٹ کہ ادھر منہ سے بات نکلی اور اُدھر عرش سے لے کر فرش تک غیب و شہود کے سارے احوال منکشف ہو گئے۔

معاذاللہ اپنے شیخ کی برتری ثابت کرنے کے لیے ایک طرف اپنے عقیدے کا خون کیا گیا اور دوسری طرف روے زمین کے جملہ اولیاء اللہ کی عظمتوں کو بھی مجروح کر دیا گیا۔

تیسری کہانی

تذکرۃ الرشید کا مصنف لکھتا ہے کہ:

"جس زمانہ میں مسئلۂ امکانِ کذب پر آپ کے مخالفین نے شور مچایا اور تکفیر کا فتویٰ شائع کیا ہے۔ سائیں توکل شاہ صاحب انبالوی کی مجلس میں کسی مولوی نے حضرت امام ربانی قدس سرہٗ (گنگوہی صاحب) کا ذکر کیا اور کہا کہ امکانِ کذب باری (خدا کے جھوٹ بول سکنے) کے قائل ہیں، یہ سن کر سائیں توکل شاہ صاحب نے گردن جھکا لی اور تھوڑی دیر مراقب رہ کر منہ اُوپر اُٹھا کر اپنی پنجابی زبان میں یہ الفاظ فرمائے۔

لوگو! تم کیا کہتے ہو؟ میں مولانا رشید احمد صاحب کا قلم عرش کے پرے چلتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔"

(تذکرۃ الرشید، ج:۲، ص:۳۲۲)

کیا سمجھے آپ! کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مولوی رشید احمد صاحب کے قلم کی لمبائی عرش کی سرحد کو پار کر گئی تھی بلکہ اس جملے کی تشہیر سے یہ دعویٰ کرنا مقصود ہے کہ تقدیر الٰہی کے نوشتے آپ ہی کے رشحات قلم سے مرتب ہو رہے تھے اور قضا و قدر کا محکمہ آپ ہی کے قلم کے تابع کر دیا گیا تھا۔

اور سائیں کی نگاہ کی دوررَسی کا کیا کہنا کہ فرش پر بیٹھے بیٹھے اس نے عرش کے اس پار کا نظارہ کرلیا۔

اور اس قصے میں سب سے زیادہ دلچسپ تماشا تو یہ ہے کہ "دانشورانِ دیوبند" نے ایک دیوانے کی بات کو نظر انداز کرنے کے بجاے اسے قبول بھی کرلیا اور قبول ہی نہیں کیا بلکہ اسے اپنا عقیدہ بنالیا جیسا کہ اسی کتاب کا مصنف اس واقعہ کا بھی راوی ہے کہ:

"مولوی ولایت حُسین صاحب فرماتے ہیں کہ میرے ہمراہ سفر حج میں ایک حکیم صاحب ساکن انبالہ تھے جو اعلیٰ حضرت حاجی صاحبؒ (امداداللہ) کے مُرید تھے۔ اسی تعلق سے ان کو حضرت امام ربانی کے ساتھ تعارف بلکہ غایت عقیدت تھی۔ وہ فرمانے لگے میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ مولانا کی زبان سے جو بات نکلتی ہے تقدیر الٰہی کے مطابق ہوتی ہے۔"

(تذکرۃ الرشید، ج:۲، ص:۲۱۹)

یہ خبر اگر صحیح ہے تو اس کی صحت کی دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو گنگوہی صاحب جملہ مقدرات الٰہی پر مطلع تھے کہ زبان اس کے خلاف کھلتی ہی نہیں تھی یا پھر ان کے منہ میں زبان نہیں تھی بلکہ "کُن" کی کنجی تھی کہ جو بات منہ سے نکلی وہ کائنات کا مقدر بن گئی۔

ان دونوں باتوں میں سے جو بات بھی اختیار کی جائے ، دیوبندی مذہب پر دین و دیانت کا ایک خون ضروری ہے۔

چوتھی کہانی

مخلص الرحمن نامی، گنگوہی صاحب کے ایک مرید تھے، ان کے متعلق تذکرۃ الرشید کے مصنف کا یہ بیان پڑھیے، لکھتے ہیں کہ:

"ایک روز خانقاہ میں لیٹے ہوئے اپنے شغل میں مشغول تھے کہ کچھ سُکر پیدا ہوا اور حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کو دیکھا کہ سامنے سے تشریف لیے جا رہے ہیں۔ چلتے چلتے ان کو مخاطب بنا کر اس طرح امر فرمایا کہ دیکھو! جو چاہو حضرت مولانا رشید احمد صاحب سے چاہنا۔"

(تذکرۃ الرشید، ج:۲، ص:۳۰۹)

شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کا گھرانہ ہندوستان میں عقیدۂ توحید کا سب سے بڑا محافظ سمجھا جاتا ہے لیکن سخت تعجب ہے کہ انہوں نے خدا کو چھوڑ کر مولوی رشید احمد سے سب کچھ چاہنے کی ہدایت فرمائی! شاہ ولی اللہ صاحب کی طرف اتنا بڑا شرک منسوب کرتے ہوئے واقعے کے راویوں کو کچھ تو شرم محسوس کرنی چاہیے تھی۔ ایک طرف تو "اپنے مولانا" کو با اختیار اور صاحب تصرف ثابت کرنے کے لیے شاہ ولی اللہ صاحب کی زبانی یہ کہلوایا جاتا ہے اور دوسری طرف اپنی توحید پرستی کا ڈھونگ رچانے کے لیے عقیدہ یہ ظاہر کیا جاتا ہے:

"ہر کسی کو چاہیے اپنی حاجت کی چیزیں اپنے رب سے مانگے۔ یہاں تک کہ نون (نمک) بھی اسی سے مانگے اور جوتی کا تسمہ جب ٹوٹ جائے وہ بھی اسی سے مانگے۔"

(تقویۃ الایمان، ص:۳۴)

اور اس واقعے میں مرید کا مشاہدہ غیب بھی کتنے زور کا ہے کہ سر کی آنکھوں سے وہ ایک وفات یافتہ بزرگ کو دیکھ لیتا ہے اور ان سے ہم کلامی کا شرف بھی حاصل کرتا ہے۔ نہ اس کی نگاہ پر عالم برزخ کا کوئی حجاب حائل ہوتا ہے اور نہ شاہ صاحب کو اپنی لحد سے نکل کر اس کے روبرو جانے سے کوئی چیز

مانع ہوتی ہے۔

دیکھ رہے ہیں آپ! توحید کے ان اجارہ داروں نے کتنی طرح کی شریعتیں گڑھ رکھی ہیں۔ انبیا و اولیا کے لیے کچھ! اور اپنے گھر کے بزرگوں کے لیے کچھ!! ہے کوئی انصاف کا خوگر! جو اس جورِ بے اماں کا انصاف کرے۔ اور حق پرستوں کو ان کا وہ حق دلائے جو مذہب اسلام نے انھیں دیا ہے۔

پانچویں کہانی

آگرہ کے کوئی منشی امیر احمد تھے تذکرۃ الرشید کے مُصنف نے ان کی زبانی ان کا ایک عجیب و غریب خواب نقل کیا ہے۔ موصوف بیان کرتے ہیں:

"گنگوہ کا ایک شخص شیعہ مذہب مر گیا اور میں نے اسے خواب میں دیکھا فوراً اس کے ہاتھ کے دونوں انگوٹھے میں نے پکڑ لیے وہ گھبرا گیا اور پریشان ہو کر بولا "جلدی پوچھو جو پوچھنا چاہو مجھے تکلیف ہے۔" میں نے کہا اچھا یہ بتاؤ کہ مرنے کے بعد تم پر کیا گذرا اور اب کس حال میں ہو؟

اس نے جواب دیا کہ عذابِ الیم میں گرفتار ہوں، حالتِ بیماری میں مولانا رشید احمد صاحب دیکھنے تشریف لائے تھے۔ جسم کے جتنے حصّہ پر مولوی صاحب کا ہاتھ لگا بس اتنا جسم تو عذاب سے بچا ہے باقی جسم پر بڑا عذاب ہے۔ اس کے بعد آنکھ کھل گئی۔"

(تذکرۃ الرشید، ج:۲، ص:۳۲۴)

بات آ گئی ہے تو اسی تذکرۃ الرشید کے مصنف نے اسی قسم کا ایک خواب مولوی اسمٰعیل نامی "ایک دیوبندی بزرگ" کے کسی خادم کے متعلق نقل کیا ہے۔ لگے ہاتھوں ذرا اسے بھی پڑھ لیجیے۔ لکھتے ہیں:

"ایک خادم تھا مولوی محمد اسمٰعیل صاحب کا، جب اس کا انتقال ہو گیا تو کسی نے اس کو خواب میں دیکھا کہ سارے بدن میں آگ لگی ہوئی ہے۔ مگر ہتھیلیاں سالم

اور محفوظ ہیں۔ اس نے پوچھا کیوں بھئی کیا حال ہے؟ اس نے کہا کیا کہوں! اعمال کی سزا مل رہی ہے سارے بدن کو تکلیف ہے مگر یہ ہاتھ حضرت مولانا کے پاؤں کو لگے تھے۔ اس لیے حکم ہوا کہ ان میں آگ لگاتے ہمیں شرم آتی ہے۔''

(تذکرۃ الرشید، ج:۲، ص:۲۷)

دیکھ رہے ہیں آپ! دربارِ الٰہی میں ان حضرات کی وجاہت و مقبولیت کا عالم؟ عذابِ آخرت سے چھٹکارا دلانے کے لیے زبان ہلانے کی بھی ضرورت نہیں پیش آئی صرف ہاتھ لگا دینا کافی ہوگیا۔ اور شیعہ جیسا باغیِ حق بھی ہاتھوں کی برکت سے محروم نہیں رہا۔

ایک یہ حضرات ہیں کہ عالمِ اسفل ہی نہیں عالمِ بالا میں بھی ان کی شوکت و سطوت کے ڈنکے بج رہے ہیں۔ لیکن رسولِ خدا، محبوبِ کبریا ﷺ کے متعلق ان حضرات کے عقیدے کی زبان یہ ہے:

''اللہ صاحب نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا کہ لوگوں کو سنا دیویں کہ میں تمہارے نفع و نقصان کا کچھ مالک نہیں اور تم جو مجھ پر ایمان لائے اور میری اُمّت میں داخل ہوئے سو اس پر مغرور ہو کر حد سے مت بڑھنا کہ ہمارا پایہ مضبوط ہے اور ہمارا وکیل زبردست ہے اور ہمارا شفیع بڑا محبوب! سو ہم جو چاہیں کریں۔ وہ ہم کو اللہ کے عتاب سے بچالے گا۔ کیوں کہ یہ بات محض غلط ہے۔ اس واسطے کہ میں آپ ہی ڈرتا ہوں اور اللہ سے ورے کہیں بچاؤ نہیں جانتا۔ سو دوسرے کو کیا بچا سکوں؟''

(تقویۃ الایمان، ص:۴۸)

اس مقام پر میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ آپ ہی اپنے ایمان کو گواہ بنا کر فیصلہ کیجیے کہ قلم کے اس تیور سے رسولِ عربی ﷺ کے وفاداروں کی دل آزاری ہوتی ہے یا نہیں؟

ضمنی طور پر درمیان میں یہ بات نکل آئی تھی، اب پھر اپنے اصل موضوع کی طرف واپس لوٹتا ہوں۔

(۲)

گنگوہی صاحب کی غیبی قوتِ ادراک کا ایک حیرت انگیز واقعہ:

حاجی دوست محمد خاں کوئی کوتوال تھے۔ تذکرۃ الرشید کے مُصنف ان کے لڑکے کے متعلق یہ واقعہ نقل کرتے ہیں کہ:

''حاجی دوست محمد خاں صاحب کے صاحبزادہ عبدالوہاب خاں ایک شخص کے معتقد ہوگئے اور بیعت کا قصد کیا۔ وہ جس شخص سے بیعت ہونا چاہتے تھے محض صورت کے درویش تھے اور واقع میں پکّے دنیادار اس لیے دوست محمد خاں کو صاحبزادہ کی یہ کجی پسند نہ آئی اور کئی بار منع کیا کہ اس شخص سے مُرید نہ ہو۔''

(تذکرۃ الرشید، ج:۲، ص:۲۱۵)

ہزار روکنے کے باوجود عبدالوہاب خاں اپنے ارادہ سے باز نہ آیا آخر ایک دن مُرید ہونے کی نیّت سے چل کھڑا ہوا۔ اس کے بعد کا واقعہ سننے کے قابل ہے لکھا ہے کہ:

''آخر حاجی صاحب نے جب بیٹے کا اصرار دیکھا تو باقتضائے محبت دست بدعا ہوئے اور مراقب ہو کر حضرت (گنگوہی) کی جانب متوجہ ہو کر خلوت میں جا بیٹھے۔''

(تذکرۃ الرشید، ج:۲، ص:۲۱۵)

ادھر باپ اپنے پیر کو حاضر و ناظر تصور کرکے مصروفِ مناجات تھا، اور اُدھر بیٹے کا قصہ سُنیے لکھتے ہیں کہ:

عبدالوہاب پیر کے پاس آئے اور مؤدب دو زانو بیٹھ گئے۔ بے اختیار پیر کی زبان سے نکلا اوّل باپ سے اجازت لے آؤ اس کے بغیر بیعت مفید نہیں ہے۔ غرض ہاتھ بیعت کے لیے تھام کر چھوڑ دیے اور انکار فرمادیا۔

(تذکرۃ الرشید، ص:۲۱۶)

اب اس کے بعد سوانح نگار کا یہ تہلکہ خیز بیان چشمِ حیرت سے پڑھنے کے قابل ہے۔ لکھتے ہیں:

حاجی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ جس وقت میں امامِ ربانی کی طرف متوجہ ہوا تو دیکھا حضرت غایت شفقت کے ساتھ عبدالوہاب کا ہاتھ پکڑ کر میرے ہاتھ میں پکڑاتے اور یوں فرماتے ہیں ''لواب یہ اس کا مرید نہ ہوگا۔'' یہ وہی وقت تھا کہ انھوں نے عبدالوہاب کا ہاتھ چھوڑا اور یہ کہہ کر بیعت سے انکار کیا کہ باپ سے اجازت لے آؤ۔''

(تذکرۃ الرشید، ص:۲۱۶)

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ! دیکھ رہے ہیں آپ!! اپنے شیخ کے حق میں جذبۂ عقیدت کی فراوانی کا یہ تماشا!!!

اِدھر حاجی صاحب نے تصور کیا اور اُدھر گنگوہی صاحب کو ساری خبر ہوگئی اور صرف خبر ہی نہیں ہوئی بلکہ وہیں سے بیٹھے بیٹھے بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر باپ کے ہاتھ میں دے بھی دیا۔ اور دوسری طرف پیر کے دل پر بھی تصرف کیا کہ اُنھوں نے بغیر کسی سببِ ظاہری کے دفعتاً مرید کرنے سے انکار کردیا۔ اور حاجی صاحب کی غیبی قوتِ ادراک کا کیا کہنا کہ اپنے خلوت کدے ہی سے انھوں نے دیکھ لیا کہ گنگوہی صاحب بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر باپ کے ہاتھ میں دے رہے ہیں اور ان کی آواز بھی سُن لی کہ ''لواب یہ اُس کا مرید نہ ہوگا۔'' نہ آنکھوں پر درمیان کے حجابات حائل ہوئے اور نہ بُعدِ مسافت کانوں تک آواز پہنچنے سے مانع ہوئی۔

یہ تو رہا دیوبندی حضرات کا اپنے گھر کے بزرگوں کے بارے میں عقیدہ! اب ذرا اِسے بھی پڑھ لیجیے:

''(جو کوئی کسی) کی صورت کا خیال باندھے اور یوں سمجھے کہ جب میں اس کا نام لیتا ہوں زبان سے یا دل سے، یا اس کی صورت یا اس کی قبر کا خیال باندھتا ہوں تو وہیں اس کو خبر ہوجاتی ہے----سوان باتوں سے مشرک ہوجاتا ہے اور اس قسم کی باتیں سب شرک ہیں۔ خواہ یہ عقیدہ انبیاء واولیاء سے رکھے خواہ پیر وشہید سے خواہ امام وامام زادہ سے خواہ بھوت وپری سے پھر خواہ یوں سمجھے کہ یہ

بات ان کو اپنی ذات سے ہے خواہ اللہ کے دینے سے۔ غرض اس عقیدے سے ہر طرح شرک ثابت ہوتا ہے۔''

(تقویۃ الایمان، ص:۸)

اور اس سلسلے میں سب سے زیادہ دلچسپ چیز تو خود مولوی رشید احمد گنگوہی صاحب کا یہ فتویٰ ہے جو فتاویٰ رشیدیہ میں شائع کیا گیا ہے کہ:۔

کسی نے یہ سوال دریافت کیا کہ تصور کرنا اولیاء اللہ کا مراقبہ میں کیسا ہے؟ اور یہ جاننا کہ ان کا تصور باندھتے ہیں تو وہ ہمارے پاس موجود ہوجاتے ہیں اور ہم کو معلوم ہوجاتے ہیں، ایسا اعتقاد کرنا کیسا ہے؟

الجواب: ایسا تصور درست نہیں اندیشہ شرک کا ہے۔''

(فتاویٰ رشیدیہ، ج:۱، ص:۸)

وہ واقعہ تھا یہ عقیدہ ہے اور دونوں کے درمیان جو کھلا ہوا تضاد ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔

اب اس کا شکوہ کس سے کیا جائے کہ صحیح وغلط اور درست و نادرست کو ناپنے کے لیے دیوبندی حضرات کے یہاں الگ الگ پیمانے کیوں ہیں؟

ہے کوئی حق کا حامی؟ جو حق کے ساتھ انصاف کرے...

(۳)

اس بات کا علم کہ کون کب مرے گا:

مولوی عاشق الٰہی میرٹھی نے تذکرۃ الرشید میں کئی ایسے واقعات نقل کیے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ گنگوہی صاحب کو اپنی اور دوسروں کی موت کا بھی علم تھا کہ کون کب مرے گا۔ ذیل میں چندواقعات ملاحظہ فرمائیے:

پہلا واقعہ

لکھا ہے کہ ایک بار نواب چھتاری سخت بیمار ہوئے۔ یہاں تک کہ سب لوگ ان کی زیست سے نااُمید ہوگئے۔ ہر طرف سے مایوس ہوجانے کے بعد ایک شخص کو گنگوہی صاحب کی خدمت میں بھیجا گیا کہ وہ نواب صاحب کے لیے دعا کریں۔ قاصد نے وہاں پہنچ کر ان سے دعا کی درخواست کی۔ اب اس کے بعد کا واقعہ خود سوانح نگار کی زبانی سُنیے۔ لکھتے ہیں کہ:

''آپ نے حاضرینِ جلسہ سے فرمایا۔''بھائی دعا کرو'' چونکہ حضرت نے خود دعا کا وعدہ نہیں فرمایا اس لیے فکر ہوا اور عرض کیا گیا کہ حضرت آپ دعا فرمادیں، اس وقت آپ نے ارشاد فرمایا۔''امر مقدر کردیا گیا ہے اور ان کی زندگی کے چند روز باقی ہیں۔'' حضرت کے اس ارشاد پر اب کسی عرض و معروض کی گنجائش نہ رہی اور نواب صاحب کی حیات سے سب کو ناامیدی ہوگئی۔''

(تذکرۃ الرشید، ج:۲، ص:۲۰۹)

مگر قاصد کو گنگوہی صاحب کے ''کُن'' پر کتنا اعتماد تھا، اس کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

تاہم قاصد نے عرض کیا کہ ''حضرت یوں دعا فرمادیجیے کہ نواب صاحب کو ہوش آجائے اور وصیت و انتظامِ ریاست کے متعلق جو کچھ کہنا سننا ہو کہہ سُن لیں۔'' آپ نے فرمایا۔''خیر اس کا مضائقہ نہیں۔'' اس کے بعد دعا فرمائی۔ اور یوں ارشاد فرمایا۔''انشاء اللہ افاقہ ہوجائے گا۔''

(تذکرۃ الرشید، ج:۲، ص:۲۰۹)

اس کے بعد سوانح نگار لکھتا ہے:

''چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ نواب صاحب کو دفعتًا ہوش آگیا اور ایسا افاقہ ہوا کہ عافیت و صحت کی خوش خبری دُور دُور پہنچ گئی۔ کسی کو خیال بھی نہ رہا کہ کیا ہونے والا ہے؟ یکا یک حالت پھر بگڑی اور مخیر و دریا دل نیک نفس و سخی رئیس نے انتقال بعالم

آخرت فرمایا۔''

(تذکرۃ الرشید، ج:۲، ص:۲۰۹)

دیکھ رہے ہیں آپ! امرِ الٰہی میں تصرف واختیار کا عالم!! جیسے مقدر کے سارے نوشتے پیشِ نظر ہیں یہاں تک معلوم ہے کہ کیا ہوسکتا ہے اور کیا نہیں ہوسکتا۔ کس امر میں مضائقہ ہے، کس میں نہیں! گویا قضاوقدر کا محکمہ بالکل اپنے گھر کا کاروبار ہوگیا ہو۔

سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ ایک طرف تو دیوبندی علما کی نظر میں اپنے گھر کے بزرگوں کا مقام یہ ہے اور دوسری طرف محبوب کبریا ﷺ کے حق میں ان کے عقیدے کی زبان یہ ہے:

''سارا کاروبار جہان کا اللہ ہی کے چاہنے سے ہوتا ہے، رسول کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔''

(تقویۃ الایمان، ص:۲۲)

اب آپ ہی انصاف کیجیے کہ امتی کے لیے یہ ڈوب مرنے کی جا ہے یا نہیں؟

دُوسرا واقعہ

مولوی صادق الیقین نام کے کوئی صاحب مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی کے دوستوں میں تھے، ان کے متعلق تذکرۃ الرشید کے مصنف مولوی عاشق الٰہی میرٹھی یہ واقعہ نقل کرتے ہیں:

''حضرت مولانا صادق الیقین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک بار سخت علیل ہوئے۔ واقفین احباب بھی یہ خبر سُن کر پریشان ہوگئے اور حضرت سے عرض کیا دعا فرمادیں۔ حضرت خاموش رہے اور بات کو ٹال دیا جب دوبارہ عرض کیا گیا تو آپ نے تسلی دی اور یوں فرمایا، میاں وہ ابھی نہیں مریں گے اور اگر مریں گے تو میرے بعد۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ اس مرض سے صحت حاصل ہوگئی اور حضرت کے وصال کے بعد اسی سال بہ ماہ شوال حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئے، مکہ معظمہ میں بیمار ہوئے مرض ہی میں عرفات کا سفر کیا یہاں تک کہ شروع محرم میں واصل بحق ہوکر

جنت المعلیٰ میں مدفون ہوئے۔"

(تذکرۃ الرشید، ج:۲، ص:۲۰۹)

ملاحظہ فرمایئے! صرف اتنا ہی نہیں معلوم تھا کہ وہ ابھی نہیں مریں گے بلکہ یہ بھی معلوم تھا کہ وہ کب مریں گے۔ "وہ میرے بعد مریں گے۔" اس ایک جملے نے دونوں کا حال ظاہر کر دیا اپنا بھی اور ان کا بھی اسے کہتے ہیں غیب دانی! نہ جبرئیل کا انتظار نہ خدا کے بتانے کی احتیاج!!

تیسرا واقعہ

مولوی نظر محمد خاں نامی کوئی شخص تھے جو گنگوہی صاحب کے دربار کے حاضر باش تھے۔ ان کے متعلق تذکرۃ الرشید کے مصنف کا یہ بیان پڑھیے۔ لکھتے ہیں:

"مولوی نظر محمد خاں نے ایک مرتبہ پریشان ہو کر عرض کیا کہ حضرت فلاں شخص جو والد صاحب سے عداوت رکھتا تھا ان کے انتقال کے بعد اب مجھ سے ناحق عداوت رکھتا ہے۔ بے ساختہ آپ کی زبان سے نکلا "وہ کب تک رہے گا" چند روز گزرے تھے کہ دفعتاً وہ شخص انتقال کر گیا۔"

(تذکرۃ الرشید، ج:۲، ص:۲۱۴)

یا تو یہ کہا جائے کہ گنگوہی صاحب کو اس کی زندگی کے بچے کھچے دن معلوم ہو گئے تھے اور انھوں نے سوالیہ لہجے میں اسے ظاہر کر دیا۔ یا پھر یہ کہا جائے کہ گنگوہی صاحب کے منہ سے نکلتے ہی اس غریب کی موت واجب ہو گئی اور چار و ناچار اسے مرنا پڑا۔ دونوں شقوں میں سے جو شق بھی اختیار کی جائے دیوبندی مذہب پر شرک سے چھٹکارا ممکن نہیں ہے۔

چوتھا واقعہ

اب تک تو دوسروں کی موت کے علم سے متعلق واقعات بیان ہوئے اب خود رشید احمد

صاحب گنگوہی کا اپنا واقعہ سنیے۔ اُن کا سوانح نگار اُن کی موت کی اصل تاریخ یوں نقل کرتا ہے:

"باختلافِ رویت ۸ر یا ۹ر جمادی الثانیہ مطابق ۱۱ر اگست ۱۹۰۵ء کو بیوم جمعہ بعد اذان یعنی ساڑھے بارہ بجے آپ نے دنیا کو الوداع کہا۔"

(تذکرۃ الرشید، ج:۲، ص:۳۳۱)

اس کے بعد یہ بیان پڑھیے:

"حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کو چھ روز پہلے سے جمعہ کا انتظار تھا بیوم شنبہ دریافت فرمایا تھا کہ آج کیا جمعہ کا دن ہے؟ خدام نے عرض کیا کہ حضرت آج تو شنبہ ہے۔ اس کے بعد درمیان میں بھی کئی بار یوم جمعہ کو دریافت کیا۔ حتّٰی کہ جمعہ کے دن جس روز وصال ہوا صبح کے وقت پھر دریافت فرمایا کہ کیا دن ہے؟ اور جب معلوم ہوا کہ جمعہ ہے تو فرمایا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔"

(تذکرۃ الرشید، ج:۲، ص:۳۳۱)

اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ چھ دن قبل ہی آپ کو اپنی موت کا علم ہو گیا تھا اور یہ علم اتنا یقینی طور پر تھا کہ جب جمعہ کا دن آیا تو آپ نے کلمۂ ترجیع پڑھ لیا۔

ملاحظہ فرمایئے! ایک طرف تو گھر کے بزرگوں کے لیے انتہائی فراخ دلی کے ساتھ یہ جذبۂ اعتراف ہے اور دوسری طرف اسی موت کے علم سے متعلق انبیا و اولیا کے حق میں عقیدے کی زبان یہ ہے:

"اسی طرح جب کوئی اپنا حال نہیں جانتا کہ کل کو کیا کرے گا تو اور کسی کا کیوں کر جان سکے۔ اور جب اپنے مرنے کی جگہ نہیں جانتا تو اور کسی کے مرنے کی جگہ یا وقت کیوں کر جان سکے۔"

(تقویۃ الایمان، ص:۲۳)

اب آپ ہی فیصلہ کیجیے کہ مذکورہ بالا واقعات سے کیا یہ حقیقت بالکل بے نقاب نہیں ہو جاتی کہ شرک و انکار کی یہ ساری تحریرات جو دیوبندی لٹریچر میں پھیلی ہوئی ہیں صرف انبیا و اولیا کے حق میں ہیں گھر کے بزرگوں پر قطعاً ان کا اطلاق نہیں ہوتا۔

(۴)

غیبی قوت ادراک کا ایک عجیب وغریب قصّہ:

اب تذکرۃ الرشید کے مصنف کی زبانی عام امور غیبیہ کے مشاہدۂ خبر سے متعلق گنگوہی صاحب کا ایک حیرت انگیز قصہ سُنیے۔ مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی کے عقیدت مندوں میں میر واجد علی قنوجی کوئی شخص گزرے ہیں۔ ان ہی سے یہ روایت نقل کی گئی ہے۔ لکھا ہے کہ:

میر واجد علی قنوجی فرماتے ہیں کہ میرے مرشد حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے مجھ سے بیان فرمایا کہ میں ایک مرتبہ گنگوہ گیا۔ خانقاہ میں ایک کورا بدھنا رکھا ہوا تھا۔ میں نے اُس کو اُٹھا کر کنویں میں سے پانی کھینچا اور اس میں بھر کر پیا تو پانی کڑوا تھا۔ ظہر کی نماز کے وقت حضرت سے ملا اور یہ قصہ بھی عرض کیا۔ آپ نے فرمایا کہ "کنویں کا پانی تو میٹھا ہے کڑوا نہیں ہے۔" میں نے وہ کورا بدھنا پیش کیا جس میں پانی بھرا تھا حضرت نے بھی پانی چکھا تو بدستور تلخ تھا۔ آپ نے فرمایا اچھا اس کو رکھ دو۔ یہ فرما کر نمازِ ظہر میں مشغول ہو گئے۔ سلام پھیرنے کے بعد حضرت نے نمازیوں سے فرمایا کہ کلمۂ طیب جس قدر جس سے پڑھا جائے پڑھو اور خود بھی حضرت نے پڑھنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر بعد حضرت نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے اور نہایت خضوع وخشوع کے ساتھ دعا مانگ کر ہاتھ منہ پر پھیر لیے۔ اس کے بعد بدھنا اُٹھا کر پانی پیا تو شیریں تھا۔ اس وقت مسجد میں جتنے نمازی تھے سب نے چکھا کسی قسم کی تلخی اور کڑواہٹ نہ تھی۔ تب حضرت نے فرمایا کہ اس بدھنے کی مٹّی اُس قبر کی ہے جس پر عذاب ہو رہا تھا۔ الحمد للہ کلمہ کی برکت سے عذاب رفع ہو گیا۔"

(تذکرۃ الرشید، ج:۲، ص:۲۱۲)

یہ واقعہ بھی عالمِ برزخ کے حالات غیب سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ اپنی غیب دانی کا یقین دلانے کے

لیے اتنا ہی بتا دینا کیا کم تھا۔ لیکن آپ نے تو یہاں تک بتا دیا کہ اس بدھنے کی مٹّی اُس قبر کی ہے جس پر عذاب ہو رہا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم کر لیا کہ اب عذاب رفع بھی ہو گیا۔ اسے کہتے ہیں مطلق العنان غیب دانی کہ جدھر نگاہ اُٹھی مستور حقیقتوں کے چہرے خود بخود بے نقاب ہوتے چلے گئے۔ اپنی غیب دانی کا تو یہ حال بیان کیا جاتا ہے لیکن سید الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں یہی گنگوہی صاحب تحریر فرماتے ہیں۔ خوں ناب آنکھوں سے یہ عبارت پڑھیے:

"یہ عقیدہ رکھنا کہ آپ (حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کو علمِ غیب تھا صریح شرک ہے۔"

(فتاویٰ رشیدیہ، ج:۲، ص:۱۴۱)

(۵)

عقیدۂ توحید سے انحراف کا ایک عبرت انگیز واقعہ:

ضلع جالندھر میں منشی رحمت علی نام کے کوئی صاحب کسی سرکاری اسکول میں ملازم تھے۔ تذکرۃ الرشید کے مصنف نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ ابتدا میں یہ صاحب غالی درجے کے بدعتی تھے۔ اُنھیں حضرت پیرانِ پیر سید عبد القادر جیلانی قدس سرہٗ سے غایت درجہ عقیدت تھی۔ حافظ محمد صالح نام کے ایک دیوبندی مولوی کی خدمت میں رہ کر کچھ دنوں تک اُنھیں استفادہ کا موقع ملا جس سے بہت حد تک اُن کے عقائد وخیالات میں تبدیلی واقع ہو گئی۔۔۔ اب اس کے بعد کا واقعہ خود مُصنف کی زبانی سُنیے۔ لکھتے ہیں کہ:

حافظ محمد صالح دام مجدہٗ کی شاگردی کے زمانہ میں اکثر حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ کے محامد ومناقب ان کے کان میں پڑتے مگر یہ متاثر نہ ہوتے اور یوں خیال کیے ہوئے تھے کہ جب تک پیرانِ پیر رحمۃ اللہ علیہ خواب میں تشریف لا کر خود ارشاد نہ فرماویں گے کہ فلاں شخص سے بیعت ہو اس وقت تک بطور خود کسی سے بیعت نہ

کروں گا۔ اسی حالت میں ایک مدت گزر گئی کہ یہ اپنے خیال پر جمے رہے۔
آخر ایک شب حضرت پیرانِ پیر قدس سرہٗ کی زیارت سے مشرف ہوئے
حضرت شیخ نے یوں ارشاد فرمایا کہ اس زمانے میں مولانا رشید احمد صاحب
گنگوہی کو حق تعالیٰ نے وہ علم دیا ہے کہ جب کوئی حاضر ہونے والا السلام علیکم
کہتا ہے تو آپ اس کے ارادہ سے واقف ہو جاتے ہیں اور جو ذکر و شغل اس
کے مناسب ہوتا ہے وہی بتلاتے ہیں۔"

(تذکرۃ الرشید، ج:۲، ص:۳۱۲)

دیکھ لیا آپ نے! صرف اپنے شیخ کی غیب دانی کا سکہ چلانے کے لیے حضرت سیدالاولیا سرکار غوث الوریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زبانی ایک ایسے عقیدے کی تشہیر کی جا رہی ہے جو دیوبندی مذہب میں قطعاً شرک ہے اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ بیان کا لب ولہجہ تردیدی بھی نہیں ہے کہ الزام اپنے سر سے ٹال سکیں۔

اب ایک طرف یہ واقعہ نظر میں رکھیے اور دوسری طرف تقویۃ الایمان کی یہ عبارت پڑھیے توحید پرستی کا سارا بھرم کھُل جائے گا:

(جو کوئی کسی کے متعلق یہ تصور کرے) کہ جو بات میرے منہ سے نکلتی ہے وہ
سب سُن لیتا ہے اور جو خیال و وہم میرے دل میں گزرتا ہے وہ سب سے واقف
ہے سو ان باتوں سے مشرک ہو جاتا ہے اور اس قسم کی باتیں سب شرک ہیں۔"

(تقویۃ الایمان، ص:۸)

دل پہ ہاتھ رکھ کر سوچیے کہ گنگوہی صاحب کے اندر غیبی قوت ادراک ثابت کرنے کے لیے ان حضرات کو شرک کے کتنے مراحل سے گزرنا پڑا۔

پہلا شرک یہ ہے کہ حضور غوث الوریٰ اگر غیب داں نہیں تھے تو اُنھیں کیونکر معلوم ہوا کہ ہمارا فلاں معتقد مرید ہونے کے لیے ہماری بشارت کا منتظر ہے اور دوسرا شرک یہ ہے کہ ان کے اندر یہ قوت تصرف بھی مان لی گئی کہ وفات کے بعد بھی جس کی مدد فرمانا چاہیں فرما سکتے ہیں۔ تیسرا شرک یہ ہے کہ سلام کے بعد اگر گنگوہی صاحب کے دل کی کیفیت ان کے پیش نظر نہیں تھی تو انھیں

کس طرح معلوم ہوا کہ مولوی رشید احمد صاحب کو حق تعالیٰ نے ایسا علم بخشا ہے کہ آپ سلام کرنے والے کے ارادے سے واقف ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ سارا شرک اس لیے گوارہ کر لیا گیا کہ اپنے مولانا کی عظمت وبزرگی کے لیے اس واقعے کو دستاویز بنانا مقصود تھا۔ ورنہ جہاں تک ماننے کا تعلق ہے یہ حضرات سرکار غوث الوریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حق میں اس طرح کی غیبی قوتِ ادراک کے ہرگز قائل نہیں ہیں بلکہ اس کے اثبات کو شرک قرار دیتے ہیں۔ جیسا کہ یہی گنگوہی صاحب ندائے یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ (یعنی اے شیخ عبدالقادر جیلانی خدا کے لیے کچھ عطا کیجیے) کے متعلق فرماتے ہیں:

"اس کلام کا پڑھنا کسی وجہ سے جائز نہیں، اگر شیخ قدس سرہٗ کو عالم الغیب
متصرف مستقل جان کر کہتا ہے تو خود شرک محض ہے اور جو یہ عقیدہ نہیں تو ناجائز
ہے کیوں کہ اس صورت میں گویا انداشرک نہ ہوا لیکن مشابہ شرک ہے۔"

(فتاویٰ رشیدیہ، ج:۱، ص:۵)

ذرا ملاحظہ فرمایئے کہ یہاں سرکار غوث اعظم کے روحانی تصرف اور غیبی قوتِ ادراک کے سوال پر کتنے احتمالات پیدا کر دیے گئے اور کیسی بال کی کھال نکالی گئی لیکن اپنی عظمت وبزرگی کی بات آگئی تو اب انہی سرکار غوث الوریٰ کے علم واختیار پر کوئی شبہہ وارد نہیں کیا گیا۔

(۶)

گنگوہی صاحب کے ایک مرید پر مغیبات کا انکشاف:

تذکرۃ الرشید کے مصنف، گنگوہی صاحب کے ایک مرید کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"ایک شخص بذریعہ خط آپ سے بیعت ہوئے اور تحریری تعلیم پر ذکر میں
مشغول ہوئے۔ چند روز میں ان پر یہ کیفیت طاری ہوئی کہ اولیائے سلاسل کی

ارواح طیبات سے لقا حاصل ہوا اور پھر یکے بعد دیگرے انبیا علیہم السلام کی پاک روحوں سے ملاقات ہوئی۔ رفتہ رفتہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ سر سے لے کر قدم تک رگ رگ اور بال بال میں ارواحِ طیبات سے وابستگی ہے۔ اسی حالت میں ایک مدہوشی اور سکر کا عالم پیدا ہوتا جس میں مغیبات کا انکشاف اور مجلس سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی دربانی کا اعزاز حاصل ہوتا۔"

(تذکرۃ الرشید، ج:۲، ص:۱۲۳)

اب فکر و دانش کے اس افلاس کا شکوہ کس سے کیا جائے کہ "دربان" کا تو یہ حال ظاہر کیا جاتا ہے کہ عالمِ غیب کا کوئی پردہ اس کی نگاہ پر حائل نہیں ہے۔ بالکل پڑوس میں رہنے والے دوستوں کی طرح انبیا اولیا کی روحوں سے ملاقات کا سلسلہ جاری ہے برزخ و غیب کے اسرار پیکرِ محسوس کی طرح پیشِ نظر ہیں لیکن "آقا" کے بارے میں عقیدے کی زبان کیا ہے ذرا اسے بھی ملاحظہ فرمائیے:

"کسی انبیاء اولیاء یا امام وشہید کی جناب میں ہرگز یہ عقیدہ نہ رکھے کہ وہ غیب کی بات جانتے ہیں بلکہ حضرت پیغمبر کی جناب میں بھی یہ عقیدہ نہ رکھے اور نہ ان کی تعریف میں ایسی بات کہے۔"

(تقویۃ الایمان، ص:۲۶)

(۷)

عقیدہ سے تصادم کا ایک عجیب واقعہ:

حاجی دوست محمد خاں مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی کے ایک نہایت مخلص خادم تھے۔ ایک بار ان کی اہلیہ کی طبیعت سخت خراب ہوگئی اب اس کے بعد کا واقعہ خود تذکرۃ الرشید کے مصنف کی زبانی سنیئے، علالت کی سنگینی کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہاتھ پاؤں کی نبضیں چھوٹ گئیں۔ غشی طاری ہوگئی اور تمام جسم ٹھنڈا ہوگیا۔

حاجی صاحب کو اہلیہ کے ساتھ محبت زیادہ تھی بے قرار ہوگئے پاس آکر دیکھا تو حالت غیر تھی، صرف سینے میں سانس چلتا ہوا محسوس ہوتا تھا، زندگی[1] سے مایوس ہوگئے رونے لگے اور سرہانے بیٹھ کر یٰسین شریف پڑھنی شروع کردی، چند لمحے گزرے تھے کہ دفعتاً مریضہ نے آنکھیں کھول دیں اور ایک لمبا سانس لے کر پھر آنکھ بند کرلی، سب نے سمجھ لیا کہ اب وقت اخیر ہے، حاجی دوست محمد خاں اس حسرت ناک نظارہ کو دیکھ نہ سکے۔ بے اختیار وہاں سے اٹھے اور مراقب ہوکر امام ربانی کی طرف متوجہ ہوئے کہ وقت آگیا ہو تو خاتمہ بالخیر ہو اور زندگی باقی ہو تو یہ تکلیف جو متواتر تین دن سے ہو رہی ہے رفع ہوجائے۔ مراقبہ کرنا تھا کہ مریضہ نے آنکھیں کھول دیں اور باتیں کرنی شروع کردیں۔ نبضیں ٹھکانے آلگیں اور افاقہ ہوگیا۔ دو تین دن میں قوت بھی آگئی اور بالکل تندرست ہوگئیں۔"

(تذکرۃ الرشید، ج:۲، ص:۲۲۱)

اس واقعہ کے بعد سوانح نگار کا یہ زلزلہ خیز بیان پڑھیے اور دریائے حیرت میں غوطہ لگائیے۔ لکھتے ہیں:

"حاجی صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ جس وقت مراقب ہوا حضرت کو اپنے سامنے پایا۔ اور پھر تو یہ حال ہوا کہ جس طرف نگاہ کرتا حضرت امام ربانی کو بہ ہیئت اصلیہ موجود دیکھتا تھا۔ تین شبانہ روز یہی حالت رہی۔"

(تذکرۃ الرشید، ج:۲، ص:۲۲۱)

نگاہ پر بار نہ ہو تو اسی کے ساتھ ذرا خود گنگوہی صاحب کا یہ فتویٰ بھی پڑھ لیجیے:

"کسی نے یہ سوال دریافت کیا کہ تصور کرنا اولیاء اللہ کا مراقبہ میں کیسا ہے؟ اور یہ جاننا کہ جب ہم ان کا تصور باندھتے ہیں تو وہ ہمارے پاس موجود ہوجاتے اور ہم کو معلوم ہوجاتے ہیں۔ ایسا اعتقاد کرنا کیسا ہے؟

الجواب:۔ ایسا تصور درست نہیں۔ اس میں اندیشہ شرک کا ہے۔"

(فتاویٰ رشیدیہ، ج:۱، ص:۸)

اس مقام پر اس سے زیادہ اور ہمیں کچھ نہیں کہنا ہے کہ اولیاء اللہ کے بارے میں یہ عقیدہ ہے اور اپنے شیخ کے بارے میں وہ واقعہ!

ایک ہی بات ایک جگہ شرک ہے اور دوسری جگہ قابلِ تحسین واقعہ! زاویہ نگاہ کے اس فرق کی معقول وجہ کیا ہو سکتی ہے اگر انصاف کا جذبہ شریکِ حال ہو تو خود ہی فیصلہ کیجیے۔

پھر دیو بندی عقیدے کی بنیاد پر یہ سوال بھی اپنی جگہ پر ہے کہ آخر ایک ہی شخص کو ہر طرف بہ ہیت اصلیہ دیکھنا کیونکر ممکن ہے؟ لیکن توحید کے اجارہ داروں کو مبارک ہو کہ یہ ناممکن بھی انھوں نے اپنے مولانا کے لیے ممکن ہی نہیں بلکہ امر واقعہ بنالیا۔

اب لگے ہاتھوں اسی کے ساتھ انہی گنگوہی صاحب کا واقعہ اور سُن لیجیے۔

یہی تذکرۃ الرشید کے مصنف مولوی عاشق الٰہی میرٹھی قصبہ نگینہ کے مولوی محمود حسن نامی کسی شخص سے روایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''مولوی محمود حسن صاحب نگینوی فرماتے ہیں کہ میری خوش دامن صاحبہ جو اپنے والد کے ہمراہ مکہ معظّمہ میں بارہ سال تک مقیم رہیں۔ نہایت پارسا اور عابدہ زاہدہ تھیں۔ سیکڑوں احادیث بھی ان کو حفظ تھیں۔ اُنھوں نے مجھ سے فرمایا کہ بیٹا! حضرت (گنگوہی) کے بہت شاگرد ہیں مگر کسی نے حضرت کو نہیں پہچانا جن ایام میں میرا قیام مکہ معظّمہ میں تھا روزآنہ میں نے صبح کی نماز حضرت کو حرم شریف میں پڑھتے دیکھا اور لوگوں سے سُنا بھی کہ یہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی ہیں گنگوہ سے تشریف لایا کرتے ہیں۔''

(تذکرۃ الرشید، ج:۲ ص:۲۱۲)

''روزانہ'' کا لفظ بتا رہا ہے کہ کسی دن بھی وہ صبح کی نماز حرم شریف میں ناغہ نہیں کرتے تھے اور ان کی مدتِ قیام کے مطابق یہ سلسلہ بارہ سال تک جاری رہا۔

اختلاف مطالع کی بنیاد پر اگر ہندوستان اور مکہ معظّمہ کے وقت میں چند گھنٹوں کا فرق

بھی مان لیا جائے تو جب بھی ۲۴ گھنٹوں میں سے کسی نہ کسی وقت معین پر حرم شریف میں پہنچنے کے لیے ان کا گھر سے غائب ہونا ازبس ضروری تھا لیکن مشکل یہ ہے کہ ان ہی مولوی عاشق الٰہی نے اپنی اسی کتاب میں ان کے معمولاتِ شبانہ روز کا جو گوشوارہ پیش کیا ہے اس میں انھیں چوبیس گھنٹے گنگوہ میں موجود دکھلایا ہے۔

پھر بارہ سال تک روزانہ ایک مقررہ وقت پر اپنے گھر سے غائب ہو جانا اور پھر واپس لوٹ آنا ایسی چیز نہیں تھی جو لوگوں سے چھپی رہ جاتی۔ اور اس کی شہرت نہ ہوتی۔

اس لیے لامحالہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ ایک ہی وقت مکے میں موجود ہوتے تھے اور گنگوہ میں بھی حاضر رہتے تھے۔ اب حاجی دوست محمد خاں کا وہ مشاہدہ جو ابھی گزرا اور دیو بند کی پارسا خاتون کی یہ روایت دونوں نظر میں رکھیے تو واضح طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ مولوی رشید احمد صاحب ایک ہی وقت میں متعدد جگہ موجود ہیں۔ لیکن یہ سُن کر آپ ششدر رہ جائیں گے کہ جس وصف کمال کو دیو بندی حضرات اپنے پیر مغاں کے لیے واقع مان رہے ہیں اسے رسول انور ﷺ کے لیے ممکن بھی نہیں تسلیم کرتے۔

چنانچہ محافل میلاد میں حضور انور ﷺ کی تشریف آوری کے امکان پر بحث کرتے ہوئے دیو بندی مذہب کے پیشوا مولوی اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں کہ:

> ''اگر ایک ہی وقت میں کئی جگہ منعقد ہو تو آیا سب جگہ تشریف لے جاویں گے یا کہیں؟ یہ تو ترجیح بلا مرجح ہے کہ کہیں جاویں کہیں نہ جاویں، اگر سب جگہ جاویں تو وجود آپ کا واحد ہے، ہزار جگہ کس طور جا سکتے ہیں۔''

(فتاوٰی امدادیہ، ج:۴، ص:۵۸)

ذہن کی قوتِ فیصلہ اگر کسی غیر کی مُٹھی میں رہن نہیں ہے تو اپنے رسول کے جذبہ عقیدت کے ساتھ انصاف کیجیے اور اسی آئینے میں ان سارے اختلافات کی نوعیت بھی پڑھ لیجیے جو اہلِ سُنّت اور دیو بندی حضرات کے درمیان نصف صدی سے جاری ہے۔

(۸)

گزشتہ واقعات کا علم:

مولوی عاشق الٰہی میرٹھی نے اپنی کتاب میں ایسے متعدد واقعات نقل کیے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی کو غیبی طور پر بغیر کسی اطلاع کے گزرے ہوئے واقعات کی بھی خبر ہوجاتی تھی۔ چنانچہ نمونے کے طور پر ذیل میں ایک واقعہ ملاحظہ فرمایئے۔

منشی نثار علی اور گوہر خاں نام کے دو شخص انگریزوں کی پلٹن میں ملازم تھے ان کے متعلق یہ واقعہ بیان کرتے ہیں:

''منشی نثار علی اور گوہر خاں ملازم پلٹن نمبر ۶۵ رخصت لے کر بہ ارادۂ بیعت لکھنؤ سے گنگوہ روانہ ہونے کو تیار ہوئے۔ دروازہ پر سواری تک آ کھڑی ہوئی۔ اتفاق سے کسی حاکم کی آمد کا تار آیا اور عین وقت پر ان کو افسر کے حکم سے رُکنا پڑا۔ دس دن بعد فارغ ہو کر گنگوہ پہنچے تو حضرت نے صاف ارشاد فرمایا کہ ''تم دونوں صاحب فلاں روز روانہ ہونا چاہتے تھے مگر روک لیے گئے تھے۔''

اور جب کھانا دسترخوان پر آیا تو کہنے لگے کہ آپ کے ساتھ دو ٹٹو بھی تو ہیں آخر وہ بھی تو میرے مہمان ہیں۔ اوّل ان کو گھاس دانہ پہنچانا چاہیے۔ حالانکہ دونوں ٹٹوؤں پر سوار ہو کر آنے کی اطلاع آپ کو کسی نے نہیں دی تھی۔''

(تذکرۃ الرّشید، ج:۲، ص:۲۳۴)

یہ اضافہ کہ ''حالانکہ دونوں ٹٹوؤں پر سوار ہو کر آنے کی اطلاع آپ کو کسی نے نہیں دی تھی'' صرف اسی لیے کیا گیا ہے کہ خوب اچھی طرح ظاہر ہوجائے کہ یہ غیب کی خبر تھی اور کسی طرح یہ شبہ نہیں کیا جائے کہ کسی نے ان کو اطلاع کردی ہوگی۔

(۹)

آئندہ واقعات کا علم:

اب آئندہ یعنی کل اور اس کے بعد کے علم سے متعلق واقعات کا سلسلہ ملاحظہ فرمایئے:

پہلا واقعہ

مولوی صادق الیقین نام کے کوئی صاحب تھے۔ ان کے باپ سُنّی تھے لیکن وہ دیوبندی علما کے زیرِ اثر رہ کر بدعقیدہ ہوگئے تھے جس سبب سے ان کے باپ اکثر ناراض رہا کرتے تھے، جب باپ بیٹے کے درمیان میں کشیدگی بہت زیادہ بڑھ گئی تو مولوی صادق الیقین گنگوہ چلے گئے اب اس کے بعد کا واقعہ خود مولوی عاشق الٰہی میرٹھی کی زبانی سنیے۔ لکھا ہے کہ:

''گنگوہ آنے کو تو آ گئے مگر والد صاحب کی ناراضی کا اکثر خیال آتا تھا۔ ایک دن حضرت کی خدمت میں حاضر تھے۔ یکا یک حضرت نے ان سے ارشاد فرمایا کہ ''میں نے تمہارے والد کی طرف خیال کیا تھا ان کے قلب میں تمہاری محبت جوش مار رہی ہے اور یہ خفگی صرف ظاہری ہے امید ہے کل پرسوں تک تمہارے بلانے کو ان کا خط بھی آجائے'' چنانچہ دوسرے ہی دن شاہ صاحب کا خط آیا۔''

(تذکرۃ الرّشید، ج:۲، ص:۲۲۰)

غیب دانی کی یہ شان قابلِ دیدنی ہے کہ کل کی بھی خبر دے دی۔ اور سیکڑوں میل کی مسافت سے دل کے مخفی حال کا بھی مشاہدہ فرمالیا۔ نہ قرآن کی کوئی آیت اس دعوے پر اثر انداز ہوئی اور نہ (خود ساختہ) عقیدۂ توحید کو کوئی ٹھیس پہنچی۔

دوسرا واقعہ

صوفی کرم حسین نام کے کوئی صاحب تھے جو مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی کی خانقاہ کے حاضر باش تھے۔ ان کے متعلق تذکرۃ الرشید کے مصنف یہ واقعہ نقل کرتے ہیں:

"صوفی کرم حسین صاحب ایک مرتبہ بیمار ہوئے اور چند روز کے بعد صحت ہوگئی۔ ان کے مکان سے طلبی کا خط پہنچا تو اُنہوں نے روانگی کا قصد کیا۔ حضرت سے جب رخصت ہونے لگے تو خلافِ عادت فرمانے لگے، کرم حسین! کل کو مت جاؤ دو تین روز کے بعد جانا۔ ارادہ کا فسخ طبع کو گراں تو ہوا مگر ٹھہر گئے، اگلے دن دفعتاً تپ ولرزاں آیا اور وہ بھی اس شدت کے ساتھ کہ عشاء کے وقت تک اُٹھ ہی نہ سکے۔ اس وقت خیال ہوا کہ آج راستہ میں ہوتا تو کیسا مزہ آتا۔"

(تذکرۃ الرشید، ج:۲، ص:۲۲۶)

یعنی گنگوہی صاحب کو معلوم تھا کہ کل بخار آئے گا۔

تیسرا واقعہ

تذکرۃ الرشید کے مُصنف نے مولوی محمد یٰسین نام کے ایک شخص کے متعلق جو مدرسۂ دیوبند میں مدرس تھے لکھا ہے کہ وہ ایک بار گنگوہ حاضر ہوئے۔ انھیں دیوبند واپس جانا تھا واپسی کی اجازت طلب کرنے کے لیے وہ دوپہر کے وقت مولوی رشید احمد صاحب کے پاس گئے اور ان سے اجازت طلب کی لیکن بے حد اصرار کے باوجود اُنہوں نے واپس ہونے کی اجازت نہیں دی۔ جب کوئی عذر کارگر نہ ہوا تو اخیر میں انھوں نے کہا کہ:

"کل کو بندہ کا مدرسہ میں حاضر ہوجانا ضروری ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ "مدرسہ کا حرج کا تو مجھے بھی بہت خیال ہے۔ لیکن تمہاری تکلیف کی وجہ سے کہتا ہوں کہ ناحق راستے میں مارے مارے پھرو گے، سخت تکلیف اُٹھاؤ گے۔" باوجود

حضرت کے بار بار اس فرمانے کے ہمیں مطلق خیال نہ ہوا کہ "شیخ ہرچہ گوید دیدہ گوید" (یعنی شیخ جو کچھ کہتا ہے دیکھ کر کہتا ہے) اپنی ہی کہے گئے۔" [1]

(تذکرۃ الرشید، ج:۲، ص:۱۲۲)

اس کے بعد انھوں نے اپنی روانگی، اور راستے کی پریشانیوں اور رات بھر مارے مارے پھرنے کی تفصیل بیان کی ہے۔

یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ "شیخ ہرچہ گوید دیدہ گوید" کا جو عقیدہ دیوبندی حضرات اپنے بزرگوں کے لیے روا رکھتے ہیں وہی عقیدہ سید الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حق میں شرکِ عظیم سمجھتے ہیں۔

چوتھا واقعہ

ارواحِ ثلٰثہ نامی کتاب کے واقعات کا ایک راوی امیر شاہ خان نے گنگوہی صاحب کے سفرِ حج کا ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں کہ ان کا جہاز جب جدّہ پہنچا تو وہاں کے افسروں نے انھیں اترنے کی اجازت نہیں دی اور قرنطینہ کے لیے اُنھیں کامران واپس جانے کا حکم دیا۔ اس کے بعد ان ہی کی زبانی پورا واقعہ سُنیے۔ لکھا ہے کہ:

"تھوڑی دیر میں ایک عرب صاحب تشریف لائے اور اُنھوں نے کہا کہ گودی کے افسر رشوت خور ہیں اور وہ کچھ لینے کے لیے یہ حجت کر رہے ہیں، تم جلدی کچھ چندہ کردو میں اُنھیں دلا کر راضی کرلوں گا۔

جب یہ خبر مولانا (گنگوہی) کو پہنچی تو آپ نے فرمایا کہ یہ شخص بالکل جھوٹا ہے کوئی اسے کچھ نہ دے۔ ہم کو کامران واپس ہونا نہیں پڑے گا ہم یہیں اُتریں گے لیکن آج نہیں اتریں گے کل اتریں گے۔ چنانچہ دوسرے روز یہ حکم ہوگیا کہ حاجیوں کو اُتر جانا چاہیے۔"

(ارواحِ ثلٰثہ، ص:۲۸۶)

کئی صفحوں پر پھیلا ہوا آپ گنگوہی صاحب کی زبان سے کل کی خبروں کا سلسلہ پڑھ چکے۔ ان کے متعلق اس غیبی علم کے مظاہرے پر آج تک کوئی معترض نہ ہوا کہ غیر اللہ کے حق میں اس قسم کا اعتقاد قرآن کے خلاف ہے۔ لیکن بُرا ہو تنگیِ دل کا کہ یہی کل کے علم و خبر کا سوال جب محبوبِ کبریا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے پیدا ہوتا ہے تو ہر دیوبندی فاضل کی زبان پر قرآن کی یہ آیت ہوتی ہے۔ وَمَاتَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَاتَکْسِبُ غَدًا۔ کوئی متنفس نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کرے گا۔

اس کتاب کا دوسرا باب جو مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی کے واقعات و حالات پر مشتمل تھا، یہاں پہنچ کر تمام ہو گیا۔

جس تصویر کا پہلا رُخ کتاب کے ابتدائی حصّے میں آپ کی نظر سے گزر چکا ہے یہ اُس کا دوسرا رُخ تھا۔ اب چند لمحے کی فرصت نکال کر ذرا دونوں رُخوں کا موازنہ کیجیے۔ اور انصاف و دیانت کے ساتھ فیصلہ کیجیے کہ تصویر کے پہلے رُخ میں جن عقائد و مسائل کو ان حضرات نے شرک قرار دیا تھا۔ جب انہی عقائد و مسائل کو اُنھوں نے اپنے حق میں قبول کر لیا تو اب کس منہ سے وہ اپنے آپ کو "موحّد" اور دوسروں کو مشرک قرار دیتے ہیں اب کتاب کا ورق اُلٹیے اور تیسرا باب پڑھیے۔

★★★------------★★★------------★★★

تیسرا باب

دیوبندی جماعت کے مذہبی پیشوا

جناب مولوی اشرف علی تھانوی

کے بیان میں

اس باب میں جناب مولوی اشرف علی صاحب تھانوی کے متعلق دیوبندی لٹریچر سے ایسے واقعات و حقائق پیش کیے گئے ہیں جن میں عقیدۂ توحید سے تصادم، اپنے مذہب سے انحراف اور منہ بولے شرک کو اپنے حق میں اسلام و ایمان بنا لینے کی عبرت انگیز مثالیں ورق ورق پر بکھری ہوئی ہیں۔ انھیں چشمِ حیرت سے پڑھیے اور وفا آشنا ضمیر کا فیصلہ سننے کے لیے گوش بر آواز رہیے!

سلسلۂ واقعات

(۱)

تھانوی صاحب کے حق میں غیب دانی کا

صاف وصریح دعویٰ:

تھانوی صاحب کے خلیفۂ خاص مولوی عبدالماجد دریابادی نے اپنی کتاب ''حکیم الامۃ'' میں ان کی ایک مجلس کا حال لکھتے ہوئے اپنے جن تاثرات کا اظہار کیا ہے وہ دیوبندی مذہب کی طرف سے حسنِ ظن رکھنے والوں کو چونکا دینے کے لیے کافی ہیں۔ لکھتے ہیں کہ:

''بعض بزرگوں کے حالات حضرت نے اپنی زبان سے اس طرح ارشاد فرمائے کہ گویا ''در حدیث دیگراں'' بعینہٖ ہم لوگوں کے جذبات وخیالات کی ترجمانی ہوتی ہے۔ دل نے کہا کہ دیکھو روشن ضمیر ہیں نہ، سارے ہمارے مخفیات ان پر آئینہ ہوتے جارہے ہیں۔ صاحبِ کشف وکرامت ان سے بڑھ کر کون ہوگا۔ (چند سطروں کے بعد) خیر اس وقت تو گہرا اثر اس غیب دانی اور کشفِ صدر کا لے کر اُٹھا۔ مجلس برخاست ہوئی۔''

(حکیم الامۃ، ص:۴۴)

اخیر کا یہ جملہ دوبارہ پڑھیے۔ یہاں بات ایک دم کھل کر سامنے آگئی ہے۔ مجاز واستعارہ کے ابہام

سے ہٹ کر بالکل صراحت کے ساتھ تھانوی صاحب کے حق میں ''غیب دانی'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہی وہ لفظ ہے جس پر پچاس برس سے یہ حضرات جنگ کرتے آرہے ہیں کہ اس لفظ کا اطلاق رسول اکرم ﷺ کی ذات پر قطعاً کفر اور شرک ہے جیسا کہ دیوبندی جماعت کے مستند امام مولوی عبدالشکور صاحب کاکوروی اپنی کتاب میں تحریر فرماتے ہیں:

''ہم یہ نہیں کہتے کہ حضور غیب جانتے تھے۔ یا غیب دان تھے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ حضور کو غیب کی باتوں پر اطلاع دی گئی۔ فقہائے حنفیہ کفر کا اطلاق اسی غیب دانی پر کرتے ہیں نہ کہ اطلاع یابی پر۔''

(فتح حقانی، ص:۲۵)

دیکھ رہے ہیں آپ! ان حضرات کے تئیں فقہائے حنفیہ کفر کا اطلاق جس غیب دانی پر کرتے ہیں وہ اقراری کفر اپنے تھانوی صاحب کے حق میں کتنی بشاشت کے ساتھ قبول کرلیا گیا ہے۔ تھانوی صاحب کی غیب دانی کے سوال پر نہ اسلام کی کوئی دیوار منہدم ہوئی ہے اور نہ قرآن کے ساتھ کسی طرح کا تصادم لازم آیا ہے۔

اب یہیں سے سمجھ لیجیے کہ ان حضرات کی کتابوں میں کفر اور شرک کے جو مباحث سینکڑوں صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں اس کے پیچھے اصل مدعا کیا ہے؟ توحید پرستی کا جذبہ اگر خلوص پر مبنی ہوتا تو کفر وشرک کے سوال پر اپنے اور بیگانے کی یہ تفریق ہرگز روا نہ رکھی جاتی۔

(۲)

بیک وقت متعدد مقامات پر تھانوی صاحب کی موجودگی کا ایک

حیرت انگیز واقعہ:

خواجہ عزیز الحسن صاحب نے اشرف السوانح کے نام سے تین جلدوں میں تھانوی صاحب کی سوانح

حیات لکھی ہے، جو خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر سے شائع کی گئی ہے۔ اُنھوں نے اپنی کتاب میں تھانوی صاحب کا ایک عجیب وغریب واقعہ نقل کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

''عرصۂ دراز ہوا ایک صاحب نے خود احقر سے یہیں خانقاہ میں بایں عنوان اپنا واقعہ بیان کیا کہ گو دیکھنے میں تو حضرت والا یہاں بیٹھے ہوئے ہیں، لیکن کیا خبر اس وقت کہاں پر ہوں، کیوں کہ میں ایک بار خود حضرت والا کو باوجود تھانہ بھون میں ہونے کے علی گڑھ میں دیکھ چکا ہوں جب کہ وہاں نمائش تھی اور اس کے اندر سخت آگ لگی تھی میں بھی اس نمائش میں اپنی دوکان لے گیا تھا جس روز آگ لگنے والی تھی اس روز خلافِ معمول عصر ہی کے وقت سے میرے قلب کے اندر ایک وحشت سی پیدا ہونے لگی تھی جس کا یہ اثر ہوا کہ باوجود اس کے کہ اصل بکری کا وقت وہی تھا لیکن میں نے اپنی دوکان کا سارا ساز وسامان قبل از وقت ہی سمیٹ سمیٹ کر بکسوں میں بھرنا شروع کر دیا۔ جب بعد مغرب آگ لگنے کا شور وغل ہوا تو چونکہ میں اکیلا ہی تھا اور بکس بھی بھاری تھے۔ اس لیے میں سخت پریشان ہوا کہ یا اللہ! دوکان سے باہر کیوں کر لے جاؤں۔

اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ دفعتاً حضرتِ والا نمودار ہوئے اور بکسوں میں سے ایک ایک بکس کے پاس تشریف لے جا کر فرمایا کہ جلدی سے اُٹھاؤ! چنانچہ ایک طرف سے تو اس بکس کو خود اُٹھایا اور دوسری طرف سے میں نے اُٹھایا، اسی طرح تھوڑی دیر میں ایک ایک کر کے سارے بکس باہر رکھوا دیے۔ اس آگ سے اور دوکان داروں کا تو بہت نقصان ہوا لیکن بفضلہٖ تعالیٰ میرا سب سامان بچ گیا۔

اس واقعہ کو سُن کر احقر (یعنی مصنف کتاب) نے ان سے پوچھا کہ آپ نے حضرت والا سے یہ نہ دریافت کیا کہ آپ یہاں کہاں؟ اس پر انھوں نے کہا کہ اجی پوچھنے گچھنے کا مجھ کو اس وقت ہوش ہی کہاں تھا۔ میں تو اپنی پریشانی

میں مبتلا تھا۔''

(اشرف السوانح، ج:۲، ص:[illegible])

حیران وششدر نہ رہ گئے ہوں تو یہ قصہ ایک بار اور پڑھ لیجیے۔ شخصِ واحد کے متعدد جگہ موجود ہونے کا ذکر یہاں بالکل صراحت کے ساتھ ہے۔ کہیں سے بھی استعارات وکنایات کا کوئی ابہام نہیں ہے۔ یہی وہ منزل ہے جہاں پھر جی چاہتا ہے کہ محافلِ میلاد میں حضور انور ﷺ کی تشریف آوری کے امکان پر تھانوی صاحب کا یہ سوال دُہرا دوں:

''اگر ایک وقت میں کئی جگہ محفل منعقد ہو تو آیا سب جگہ تشریف لے جاویں گے یا کہیں؟ یہ تو ترجیح بلا مرجح ہے کہ کہیں جاویں کہیں نہ جاویں، اور اگر سب جگہ جاویں تو وجود آپ کا واحد ہے ہزار جگہ کس طور جا سکتے ہیں۔''

(فتاویٰ امدادیہ، ج:۴، ص:۵۸)

کس طور جا سکتے ہیں؟ اب اس سوال کا جواب دینے کی ضرورت باقی نہیں ہے۔ ویسے ہم اس بات کے مدعی بھی نہیں کہ وہ ہر محفل میں تشریف لے جاتے ہیں۔ البتہ کوئی بھی غیر جانب دار شخص تھانوی صاحب کے اس واقعے کے ضمن میں ان سوالات کا سامنا کیے بغیر نہیں رہ سکتا، جو اچانک ذہن کی سطح پر اُبھر آتے ہیں۔

پہلا سوال تو یہی ہے کہ دیوبندی حضرات کے یہاں صحیح وغلط کے جانچنے کا پیمانہ الگ الگ کیوں ہے۔ بات اگر غلط ہے تو ہر جگہ غلط ہونی چاہیے اور اگر صحیح ہے تو دوسروں کے حق میں بھی اس کی صحت کیوں نہیں تسلیم کی جاتی؟ ایسا کیوں ہے کہ ایک ہی بات رسول کونین ﷺ کے حق میں تو کفر ہے، شرک ہے، ناممکن ہے۔ لیکن اپنے گھر کے بزرگوں کے حق میں اسلام ہے، عین ایمان ہے اور امر واقعہ ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ تھانہ بھون میں موجود رہ کر علی گڑھ میں پیش آنے والے حادثہ کو قبل از وقت معلوم کر لینا کیا غیبی ادراک کی وہی قوت نہیں ہے جس کا پیغمبر اعظم ﷺ کے حق میں

دیوبندی حضرات مسلسل انکار کرتے چلے آرہے ہیں اور اسی انکار کی بنیاد پر وہ اپنی جماعت کو "موحّدین" کی جماعت کہتے ہیں۔

تیسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چشم زدن میں ایک مقام سے دوسرے مقام پر پہنچ کر کسی مصیبت زدہ کی مدد کرنا کیا دیوبندی مذہب کی زبان میں یہ خدائی اختیارات کی چیز نہیں ہے؟

اور پھر جس قدرت و اختیار اور علم و انکشاف کا وہ سیدالانبیا ﷺ تک کے حق میں شدت سے انکار کرتے آئے ہیں۔ تعجب ہے کہ اس کو اپنے حق میں ثابت کرتے ہوئے انھیں ذرا بھی عقیدۂ توحید کے تقاضوں سے انحراف نظر نہیں آیا۔ ان سوالات کے جوابات کے لیے میں آپ ہی کے ضمیر کا انصاف چاہوں گا۔

(۴)

ایک اور عبرت انگیز کہانی:

توحید پرستی کے غرور میں خوش عقیدہ مسلمانوں کو بے دریغ مشرک، بدعتی اور قبر پرست کہنے والوں کی ایک اور عبرت خیز کہانی سنیئے:۔

انھی مولوی اشرف علی صاحب تھانوی کے سوانح نگار اشرف السوانح میں تھانوی صاحب کے پردادا محمد فرید صاحب کی وفات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کسی بارات میں تشریف لے جارہے تھے کہ ڈاکوؤں نے آکر بارات پر حملہ کیا ان کے پاس کمان تھی اور تیر تھے انھوں نے ان ڈاکوؤں پر دلیرانہ تیر برسانا شروع کیے۔ چونکہ ڈاکوؤں کی تعداد کثیر تھی اور ادھر بے سروسامانی تھی۔ یہ مقابلے میں شہید ہوگئے۔"

(اشرف السوانح، ج:۱، ص:۱۲)

اس کے بعد کا قصہ چشمِ حیرت سے پڑھنے کے قابل ہے۔ لکھا ہے کہ:

"شہادت کے بعد ایک عجیب واقعہ ہوا، شب کے وقت اپنے گھر مثل زندہ کے تشریف لائے اور اپنے گھر والوں کو مٹھائی لا کر دی اور فرمایا کہ اگر تم کسی سے ظاہر نہ کروگی تو اس طرح سے روز آیا کریں گے۔ لیکن ان کے گھر کے لوگوں کو یہ اندیشہ ہوا کہ گھر والے جب بچوں کو مٹھائی کھاتے دیکھیں گے تو معلوم نہیں کیا شبہہ کریں گے اس لیے ظاہر کردیا اور آپ تشریف نہیں لائے۔ یہ واقعہ خاندان میں مشہور ہے۔"

(اشرف السوانح، ج:۱، ص:۱۲)

اللہ اکبر! ہم اگر مرسلین وانبیا شہداے مقربین اور اولیاے کاملین کی صرف روحوں کے بارے میں یہ عقیدہ رکھ لیں کہ خداے قدیر نے انھیں عالمِ برزخ میں زندوں کی طرح حیات اور تصرف کی قدرت بخشی ہے تو بدعت وشرک، مردہ پرستی اور جاہلیت کے طعنوں سے ہمارا جینا دوبھر کردیا جاتا ہے۔ دارالافتا بادل کی طرح گرجنے اور برسنے لگتے ہیں۔

لیکن تھانوی صاحب کے "جد مقتول" کے متعلق اس واقعہ کی اشاعت پر کہ وہ زندوں کی طرح گھر پلٹ کر واپس آئے۔ دوبدو باتیں کیں، مٹھائی پیش کی، اور اسی شان سے ہر روز آنے کا مشروط وعدہ کیا اور جب شرط کی خلاف ورزی کی گئی تو آنا بند کردیا۔ ان تمام باتوں پر کوئی بھی گریبان نہیں تھامتا، کوئی بھی ان چیزوں کو شرک نہیں ٹھہراتا، کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ ان کی لحد میں مٹھائی کی دوکان کس نے کھولی اور قرآن وحدیث میں اس طرح کے اختیارات کی دلیل کہاں سے ہے۔ نیز یہ بات ان تک کیسے پہنچی کہ ان کی گھروالی نے ان کے آنے کا راز فاش کردیا ہے اور انھوں نے آنا بند کردیا۔

ہے کوئی دیانت وانصاف کا حامی جو دیوبندی علما سے جاکر پوچھے کہ جو عقیدہ رسول ونبی، غوث وخواجہ اور مخدوم وقطب کی بابت شرک ہے وہی تھانوی صاحب کے پردادا کی بابت کیوں کر ایمان واسلام بن گیا ہے۔ آنکھوں میں دھول جھونک کر توحید پرستی کا یہ سوانگ آخر کب تک رچایا جائے گا؟

(۴)

ایک اور ایمان شکن واقعہ:

اب لگے ہاتھوں اسی طرح کا ایک اور واقعہ ملاحظہ فرمایئے۔ جس کے راوی بھی مولوی اشرف علی صاحب تھانوی ہیں۔ موصوف بیان کرتے ہیں کہ:

''مولانا اسمٰعیل دہلوی کے قافلے میں ایک شخص شہید ہوگئے جن کا نام بیدار بخت تھا۔ یہ مجاہد دیوبند کے رہنے والے تھے۔ ان کی شہادت کی خبر آچکی تھی۔ ان کے والد حشمت علی خاں صاحب حسبِ معمول دیوبند میں اپنے گھر میں ایک رات تہجد کی نماز کے لیے اُٹھے تو گھر کے باہر گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز آئی۔ انھوں نے دروازہ کھولا تو دیکھ کر حیران ہوئے کہ ان کے بیٹے بیدار بخت ہیں۔ بہت حیرانگی بڑھی کہ یہ تو بالاکوٹ میں شہید ہوگئے تھے۔ یہاں کیسے آگئے؟ بیدار بخت نے کہا جلدی کوئی دری وغیرہ بچھایئے حضرت مولانا اسمٰعیل صاحب اور سید (احمد) صاحب یہاں تشریف لارہے ہیں۔ حشمت خاں نے فوراً ایک بڑی چٹائی بچھادی۔ اتنے میں سید صاحب اور مولانا شہید اور چند دوسرے رفقا بھی آگئے۔ حشمت خاں صاحب نے محبت پدری کی وجہ سے سوال کیا کہ تمہارے کہاں تلوار لگی تھی؟ بیدار بخت نے سر سے اپنا ڈھاٹا کھولا اور اپنا نصف چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر اپنے باپ کو دکھایا کہ یہاں تلوار لگی تھی۔ حشمت خاں نے کہا، بیٹا! یہ ڈھاٹا پھر سے باندھ لو، مجھ سے یہ نظارہ نہیں دیکھا جاتا۔ تھوڑی دیر بعد یہ تمام حضرات واپس تشریف لے گئے۔

صبح کو حشمت خاں کو شبہہ ہوا کہ یہ کہیں خواب تو نہیں تھا مگر چٹائی کو بغور دیکھا تو خون کے قطرے موجود تھے۔ یہ وہ قطرے تھے جو بیدار بخت کے چہرے سے

گرتے ہوئے اس کے والد نے دیکھے تھے۔ ان قطروں کو دیکھ کر حشمت خاں سمجھ گئے کہ یہ بیداری کا واقعہ ہے خواب کا نہیں۔

اخیر میں چند راویوں کے نام گنا کر فرماتے ہیں کہ اس حکایت کے اور بھی بہت سے معتبر راوی ہیں۔''

(ملفوظات مولانا اشرف علی تھانوی، ص:۴۰۹، مطبوعہ: پاکستان)

(بحوالہ: ہفت روزہ ''چٹان''، ۲۴ر دسمبر ۱۹۶۲ء)

اس عجیب وغریب واقعے پر کوئی تبصرہ کرنے سے پہلے یہ بتادینا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں کہ دیوبند کے یہ شہید اعظم جنھوں نے کرشمہ سازی میں دنیا کے تمام شہیدوں کو اپنے پیچھے چھوڑ دیا ہے کس طرح کی جنگ میں قتل کیے گئے تھے۔ وہ کوئی جہاد فی سبیل اللہ تھا یا جنگ آزادی تھی۔ سچ کا بول بالا اور جھوٹ کا منہ کالا ہو کہ یہ بحث بھی شیخ دیوبند جناب مولوی حسین احمد صاحب ٹانڈوی نے طے کردی ہے جیسا کہ اپنی خودنوشت سوانح حیات کی دوسری جلد میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

''سید صاحب کا اصل مقصد چونکہ ہندوستان سے انگریزی تسلط اور اقتدار کا قلع قمع کرنا تھا جس کے باعث ہندو اور مسلمان دونوں ہی پریشان تھے۔ اس بنا پر آپ نے اپنے ساتھ ہندوؤں کو شرکت کی دعوت دی اور صاف صاف اُنھیں بتادیا کہ آپ کا واحد مقصد ملک سے پردیسی لوگوں کا اقتدار ختم کرنا ہے۔ اس کے بعد حکومت کس کی ہوگی اس سے آپ کو غرض نہیں ہے۔ جو لوگ حکومت کے اہل ہوں گے ہندو یا مسلمان یا دونوں، وہ حکومت کریں گے۔''

(نقشِ حیات، ج:۲، ص:۱۳)

آپ ہی انصاف سے بتایئے! کہ مذکورہ حوالے کی روشنی میں سید صاحب کے اس لشکر کے متعلق سوا اس کے اور کیا رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ وہ ٹھیک انڈین نیشنل کانگریس کے رضا کاروں کا ایک دستہ تھا جو ہندوستان میں سیکولر اسٹیٹ (لادینی حکومت) قائم کرنے کے لیے اٹھا تھا۔

ویسے جہاں تک شہیدوں کی حیات اور ان کی روحانی سطوت کا تعلق ہے تو اس پر قرآن کی بے شمار آیتیں شاہد ہیں۔ لیکن یہ سارے فضائل اُن مجاہدین کے حق میں ہیں، جو خدا کی زمین پر خدا کے دین کی بادشاہت اور اسلام کا سیاسی اقتدار قائم کرنے کے لیے اپنا خون بہاتے ہیں۔ لادینی حکومت اور ''ملی جلی سرکار'' بنانے کے لیے جو فوج اکٹھی کی جائے نہ وہ مجاہدین اسلام کی فوج کہلاسکتی ہے اور نہ اس فوج کے مقتول سپاہی کو ''اسلامی شہید'' قرار دیا جاسکتا ہے۔

لیکن شخصیت پرستی کی یہ ستم ظریفی دیکھیے کہ اس قصے میں جنگ آزادی کے ایک سیاسی مقتول کو بدر و اُحد کے شہیدوں سے بھی آگے بڑھا دیا گیا ہے۔ کیوں کہ اسلام کے سارے شہیدوں پر اُنھیں برتری حاصل ہونے کے باوجود ان کے متعلق بھی ایسی کوئی روایت نہیں ملتی کہ وہ اپنا کٹا ہوا سر لے کر زندوں کی طرح اپنے گھر آئے ہوں اور گھر والوں سے بالمشافہ بات چیت کی ہو۔

دیوبندی ذہن کی یہ بوالعجبی بھی قابلِ دید ہے کہ قدرت و اختیار کی جو بات وہ اپنے ایک سیاسی مقتول کے لیے بے چون و چرا تسلیم کرلیتے ہیں اُسی کو ہم اگر حُسین و کربلا کے شہیدوں کے لیے مان لیں تو ہمیں مشرک ٹھہرایا جاتا ہے۔ لیکن ان کے عقیدۂ توحید کی اجارہ داری میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

(۶)

خود بینی کی ایک شرم ناک کہانی:

اب ایک اور دلچسپ واقعہ سُنیے: اسی اشرف السوانح کے مصنف تھانوی صاحب کے متعلق لکھتے ہیں:

''حضرت والا ایک مُریدنی کا واقعہ بیان فرمایا کرتے ہیں کہ اس نے سکرات کے عالم میں میرا نام لے کر کہا کہ وہ اونٹنی لے کر آئے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس پر بیٹھ کر چل! پھر اس کے بعد اُس کا انتقال ہوگیا۔''

(اشرف السوانح، ج:۳، ص:۸۶)

اپنی غیب دانی اور قوتِ تصرف کی یہ خاموش تبلیغ ذرا ملاحظہ فرمایئے۔ کوئی دوسرا نہیں خود اپنے متعلق آپ ہی بیان فرما رہے ہیں۔ کوئی بے گانہ سُنے تو البتہ اس واقعہ کی صحت پر شک کرسکتا ہے۔ لیکن مریدین و معتقدین کس قلب و گوش کے ہوتے ہیں، یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ پیر صاحب انکار بھی کردیں تو وہ اسے تواضع پر محمول کریں گے۔ تھانوی صاحب اس واقعہ کے اظہار سے اپنے حلقہ بگوشوں کو یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ اُنھیں اپنی مُریدنی کی موت کا وقت معلوم ہوگیا تھا اور وہ اسے لینے کے لیے اُونٹ کی سواری لے کر اس کے پاس پہنچ گئے۔

اس واقعے سے جہاں ان کی غیب دانی پر روشنی پڑتی ہے، وہیں ان کی قوتِ تصرف بھی پورے طور پر نمایاں ہوجاتی ہے کہ اپنے وجود کو متعدد جگہ پہنچا دینا کسی کے لیے ناممکن ہو تو ہو لیکن ان کے لیے امرِ واقعہ ہے۔

ایک اور لطیفہ:

اس واقعے کے بیان سے کتاب کے مصنف نے یہ مدعا ظاہر کیا ہے کہ وجودِ انسانی کے ہر مرحلے میں تھانوی صاحب اپنے مُریدین و متوسلین کے لیے کارساز و نجات دہندہ تھے۔

چنانچہ اس مدعا کو ثابت کرنے کے لیے صاحبِ کتاب نے متعدد واقعات نقل کیے ہیں۔ نمونے کے طور پر کتاب کے چند اقتباسات ذیل میں ملاحظہ فرمایئے، لکھتے ہیں کہ:

''حضرت والا کے متوسلین کے حُسنِ خاتمہ کے بہ کثرت واقعات ہیں جن سے مقبولیت و برکت کا سلسلہ ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ خود حضرت والا فرمایا کرتے ہیں کہ حضرت حاجی (یعنی تھانوی صاحب کے پیر) کے سلسلہ کی یہ برکت ہے کہ جو بلا واسطہ یا بالواسطہ حضرت سے بیعت ہوا اس کا بفضلہٖ تعالیٰ خاتمہ بہت اچھا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ متوسلین گو مُرید ہونے کے بعد دنیا دار ہی رہے مگر ان کا بھی خاتمہ بفضلہٖ تعالیٰ اولیاء اللہ کا سا ہوا۔''

(اشرف السوانح، ج:۲، ص:۸۲)

یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ اولیاء اللہ کی طرح خاتمہ کے لیے اب عبادت وتقویٰ اور اعمال صالحہ کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ تھانوی صاحب کے ہاتھ پر صرف مرید ہوجانا اس بات کی ضمانت ہے کہ اولیاء اللہ کا سا انجام اس کے حق میں مقدر ہوگیا۔

اب اس سے بھی زیادہ ایک عبرت انگیز قصّہ سنیے۔ کتاب کے مُصنف لکھتے ہیں کہ:

احقر سے میرے متعدد پیر بھائیوں نے اپنی بعض مستورات کے حُسنِ خاتمہ کے عجیب وغریب واقعات بیان کیے ہیں جو حضرت والا سے مرید تھیں۔

احقر کے ایک بہنوئی تھے جو عرصۂ دراز ہوا حضرت والا سے کانپور جا کر مُرید ہوآئے تھے جب کہ اتفاقاً حضرت والا وہاں تشریف لائے ہوئے تھے۔ بعد انتقال ایک صالحہ بی بی نے ان کو خواب میں دیکھا کہ کہہ رہے ہیں کہ بہت ہی اچھا ہوا جو میں پہلے سے حضرت مولانا سے کانپور جا کر مُرید ہوآیا، میں یہاں بڑے آرام میں ہوں۔"

(اشرف السوانح، ج:۳، ص:۸۶)

ملاحظہ فرمایئے! صرف ہاتھ تھام لینے کی یہ برکت ظاہر ہوئی کہ عالم آخرت کا سارا معاملہ درست ہوگیا۔ اُس عالم کے کسی نو وارد کا یہ کہنا کہ "بہت اچھا ہوا جو میں حضرت مولانا سے مرید ہوگیا۔" بلا وجہ نہیں ہے یقیناً اس نے وہاں اپنے پیر کی نسبتِ غلامی کا کوئی اعزاز ضرور دیکھا ہوگا۔

اب ایک طرف دربارِ خداوندی میں تھانوی صاحب کے اثر ورسوخ کی یہ شان دیکھیے کہ ان کا ایک ادنیٰ مرید بھی ان کی نسبتِ غلامی کے اعزاز سے محروم نہیں رہتا اور دوسری طرف محبوبِ کبریا ﷺ کے حق میں ان حضرات کے دلوں کا بخل ملاحظہ فرمایئے۔ آنکھوں سے لہو کی بوند ٹپک پڑے گی۔ تقویۃ الایمان کے مصنّف لکھتے ہیں:

"اُنھوں نے اپنی بیٹی تک کو کھول کر سنا دیا کہ قرابت کا حق ادا کرنا اسی چیز میں ہوسکتا ہے کہ اپنے اختیار کی ہو اور اللہ کے ہاں کا معاملہ میرے اختیار سے باہر

ہے۔ وہاں میں کسی کی حمایت نہیں کرسکتا اور کسی کا وکیل نہیں بن سکتا۔ سو وہاں کا معاملہ ہر کوئی اپنا درست کرلے اور دوزخ سے بچنے کی ہر کوئی تدبیر کرلے[1]۔"

(تقویۃ الایمان ملخصاً، ص:۳۸)

(۵)

نیازمندوں میں تھانوی صاحب کی غیب دانی کے عقیدے کا چرچا

تھانوی صاحب کی غیب دانی سے متعلق ان کے حاشیہ نشینوں اور مریدین کا ذہن بھی پڑھنے کی چیز ہے اس سے اس ماحول کا اندازہ ہوگا جس پر کسی بھی مذہبی پیشوا کے مزاج وخیالات کا عکس پڑتا ہے۔ اشرف السوانح کا مُصنف لکھتا ہے کہ:

"اس امر کی تصدیق بار ہا لوگوں سے سُننے میں آئی اور خود بھی بار ہا اس کا تجربہ ہوا کہ جو دل میں لے کر آئے یا جو اشکال قلب میں پیدا ہوئیں قبل اظہار ہی اس کا جواب حضرت والا کی زبان فیض ترجمان سے ہوگیا، یا باطنی پریشانی کی حالت میں حاضر ہوئے تو خطاب خاص یا خطاب عام میں کوئی بات ایسی فرمادی جس سے تسلّی ہوگئی۔"

(اشرف السوانح، ص:۵۹)

اب لگے ہاتھوں اسی کے ساتھ تھانوی صاحب کی غیب دانی کے متعلق ان کے ایک حلقہ بگوش کا جذبۂ یقین اور تھانوی صاحب کا دلچسپ جواب ملاحظہ فرمایئے۔ لکھتے ہیں کہ:

"ایک مشہور فاضل نے جزماً اپنا یہی اعتقاد (کہ آپ غیب داں ہیں) تحریر فرما کر بھیجا تو حضرت والا نے ان کے خیال کی نفی فرمائی اور جب پھر بھی انہوں نے نہ مانا اور اس نفی کو تواضع پر محمول کیا تو حضرت والا نے تحریر فرمایا کہ وہ تاجر بڑا خوش قسمت ہے جو اپنے سودے کا ناقص ہونا خود ظاہر کررہا ہے، لیکن خریدار پھر

بھی یہی کہہ رہا ہے کہ نہیں یہ ناقص نہیں ہے بہت قیمتی ہے۔"

(اشرف السوانح، ج:۳، ص:۵۹)

اب بتایئے کون مرید ہے جو اپنے پیر کو خوش دیکھنا نہیں چاہتا۔ اس جواب میں اپنی غیب دانی کا اعتقاد رکھنے والوں کے لیے خاموش حوصلہ افزائی کا جو جذبہ کارفرما ہے وہ اتنا نمایاں ہے کہ اس پر کوئی پردہ نہیں ڈالا جاسکتا۔ تھانوی صاحب کے بارے میں غیب دانی کا عقیدہ اگر شرک تھا تو یہاں فتوے کی زبان کیوں نہ استعمال کی گئی؟

اور سب سے سنگین الزام تو یہ ہے کہ تھانوی صاحب کے انکار کو تواضع پر محمول کرلیا گیا اور انھوں نے دبی زبان سے خود اس کی توثیق بھی فرمادی لیکن یہ کیسا اندھیر ہے کہ بعض چیزوں کے علم وخبر کے متعلق رسول اللہ ﷺ کے انکار کو ہزار فہمائش کے باوجود تواضع پر محمول نہیں کیا جاتا۔ بلکہ نصف صدی سے یہی اصرار کیا جارہا ہے کہ معاذ اللہ حقیقتاً وہ مخفیات کے علم وخبر سے عاری تھے۔

اب اس مقدمے کا فیصلہ بھی آپ ہی کے جذبۂ انصاف پر چھوڑتا ہوں۔

(۷)

ایک اور ایمان شکن کہانی:

اشرف السوانح کے مصنف نے تھانوی صاحب کے متعلق قبل ولادت کی ایک پیش گوئی نقل کی ہے عبارت کا یہ ٹکڑا پڑھنے کے قابل ہے:

"نامِ نامی اشرف علی ہے۔ یہ نام حضرت حافظ غلام مرتضیٰ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے جو اس زمانہ کے مقبول عام اور مشہور انام اہل خدمت مجذوب تھے۔ قبل ولادت حضرت والا بلکہ استقرار حمل ہی بطور پیش گوئی تجویز فرمادیا تھا۔"

(اشرف السوانح، ج:۱، ص:۷)

تھانوی صاحب نے مقدمہ "حسام عبرت" کے نام سے خود بھی اپنا ایک "میلادنامہ" مرتب کیا ہے

جس میں انھوں نے ایک نہایت دلچسپ روایت بیان کی ہے جو پڑھنے کے قابل ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

"انھوں نے حضرت حافظ غلام مرتضیٰ مجذوب پانی پتی سے شکایت کی کہ حضرت میری اس لڑکی کے لڑکے زندہ نہیں رہتے۔ حافظ صاحب نے بطریق معمہ فرمایا کہ عمر و علی کی کشاکش میں مرجاتے ہیں۔ اب کے بار علی کے سپرد کردینا، زندہ رہے گا۔ (چند سطروں کے بعد) پھر فرمایا اس کے دو لڑکے ہوں گے اور زندہ رہیں گے۔ ایک کا نام اشرف علی خاں رکھنا دوسرے کا نام اکبر علی خاں۔ نام لیتے وقت خاں اپنی طرف سے جوش میں آکر بڑھا دیا تھا۔ کسی نے پوچھا کہ حضرت کیا وہ پٹھان ہوں گے؟ فرمایا نہیں اشرف علی اور اکبر علی نام رکھنا۔

یہ بھی فرمایا کہ ایک میرا ہوگا وہ مولوی ہوگا اور حافظ ہوگا اور دوسرا دنیادار ہوگا۔ چنانچہ یہ سب پیش گوئیاں حرف بہ حرف راست نکلیں۔" (اور اس کے بعد صاحبِ کتاب لکھتے ہیں کہ)

"حضرت والا فرمایا کرتے ہیں کہ یہ جو کبھی اُکھڑی اُکھڑی باتیں کرنے لگتا ہوں، ان ہی مجذوب کی روحانی توجہ کا اثر ہے جن کی دعا سے میں پیدا ہوا ہوں۔"

(اشرف السوانح، ج:۱، ص:۱۷)

ماں کے پیٹ میں کیا ہے؟ یہ وہ غیبی علم ہے جس کا دیوبندی حضرات کے تئیں غیر خدا کے لیے ماننا شرک ہے، لیکن غضب دیکھیے کہ اپنے متعلق حمل ہی نہیں استقرارِ حمل سے بھی پہلے کا علم تسلیم کرلیا گیا اور صرف اپنا ہی نہیں ساتھ ساتھ اپنے بھائی کا بھی اور وہ بھی اتنا واضح کہ نام تک تجویز فرمادیا اور اوصاف واحوال کی بھی نشان دہی کردی۔

دیوبندی مذہب میں اسی قوت کا نام خدائی اختیار ہے۔ لیکن اپنی شان کے اظہار کے

لیے یہ خدائی قوت بھی غیر خدا کے حق میں بے چون و چرا تسلیم کر لی گئی اور عقیدۂ توحید پر ذرا آنچ تک نہیں آئی۔

(۸)

دیو بندی جماعت کے ایک شیخ مولوی عبدالرحیم شاہ رائے پوری کے متعلق کتاب ارواحِ ثلٰثہ میں تھانوی صاحب کا یہ منہ بولا بیان نقل کیا گیا ہے:

"فرمایا کہ مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری کا قلب بڑا نورانی تھا میں ان کے پاس بیٹھنے سے ڈرتا تھا کہ کہیں میرے عیوب منکشف نہ ہو جائیں۔"

(ارواحِ ثلٰثہ، ص: ۴۰۱)

دین و دیانت کا خون اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ ایک امّتی کا قلب اتنا نورانی ہو جائے کہ اعمال و جوارح کی معنوی کیفیات تک اس سے مخفی نہ رہ سکیں اور وہ چھپ کر کیے جانے والے عیوب تک سے باخبر ہو جائے۔ لیکن یہی عقیدہ پیغمبروں کے حق میں لائقِ گردن زدنی سمجھا جائے۔

سچ پوچھیے تو دیو بندی حضرات کے ساتھ مذہبی اختلافات کی پوری سرگزشت میں سارا ماتم دل کی حرماں نصیبی کا ہے کہ اپنے بزرگوں کے حق میں یہ لوگ جتنا کشادہ دل واقع ہوئے ہیں اس کے ننانوے حصّے کے برابر بھی اگر مدنی سرکار کے حق میں ان کے دل کا کوئی گوشہ نرم ہو جاتا تو مصالحت کی بہت سی راہیں نکل سکتی تھیں۔

اپنی جماعت کے دوسرے بزرگ کے حق میں اسی غیب دانی سے متعلق تھانوی صاحب کا ایک اور اعتراف ملاحظہ فرمائیے۔ ان کے ملفوظات کا مرتب لکھتا ہے کہ:

"(ایک دن تھانوی صاحب نے) حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بابت فرمایا کہ انھوں نے خبر دے دی تھی اس وبا کی جس میں ان (کے) اعزہ نے وفات پائی تھی۔

پھر فرمایا کہ مولانا تھے بڑے صاحب کشف! رمضان ہی میں خبر دے دی تھی

کہ ایک بلائے عظیم رمضان کے بعد آوے گی، ابھی آجاتی لیکن رمضان کی برکت سے رُکی ہوئی ہے اگر لوگ بچنا چاہیں تو ہر چیز میں صدقات دلے دیں۔

(حُسن العزیز، ج:۱، ص:۲۹۳)

کل کیا ہوگا اس کا تعلق بھی علم غیب سے ہے۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ بات یہاں کل سے بھی آگے نکل گئی ہے اور علم بھی تو صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ ایک بلا آنے والی ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہے کہ وہ ابھی آجاتی مگر رمضان کی برکت سے رُکی ہوئی ہے اور لوگ صدقہ دے دیں تو واپس بھی لوٹ جائے گی۔

اب ہماری مظلومی کے ساتھ انصاف کیجیے کہ یہی عقیدہ اگر ہم کسی نبی یا ولی کے حق میں جائز تصور کر لیں تو ہمارا ایمان و اسلام خطرے میں پڑ جاتا ہے اور یہ اپنے سارے قبیلے کے حق میں ڈنکا پیٹ رہے ہیں تو یہاں سب خیریت ہے۔

چھوٹے میاں کا قصہ:

اب تک تو قبیلے کے شیوخ کا تذکرہ تھا۔ اب چھوٹے میاں کا واقعہ سُنیے۔ اشرف السوانح کے مُصنف نے تھانوی صاحب کے خلیفۂ مجاز حافظ عمر علی گڑھی کے غیبی انکشافات کے متعلق ایک نہایت حیرت انگیز واقعہ بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"ایک بار حافظ صاحب رات کی ریل سے تھانہ بھون حاضر ہوئے تو جب ریل (تھانوی صاحب کی) خانقاہ کے محاذ سے گزری تو اُنھوں نے بیداری میں دیکھا کہ مسجد خانقاہ کے گنبد سے آسمان تک انوار کا ایک تار لگا ہوا ہے۔"

(اشرف السوانح، ج:۲، ص:۶)

ایک تیر میں دو نشانہ اسی کو کہتے ہیں ایک طرف اپنی غیبی قوت انکشاف کا دعویٰ بھی ہے کہ نور کے اس سلسلے کا تعلق عالمِ غیب ہی سے تھا۔ اور دوسری طرف یہ بھی ظاہر کرنا مقصود ہے کہ روئے زمین پر

خانۂ کعبہ اور گنبد خضرا کی طرح تھانوی صاحب کی مسجد و خانقاہ کا گنبد بھی غیبی انوار و تجلیات کے نزول اجلال کا مرکز ہے۔

اور جب خلیفۂ مجاز کی غیبی قوتِ ادراک کا یہ حال ہے کہ ماتھے کی آنکھ سے عالم غیب کا مشاہدہ کر رہے ہیں تو اسی سے حساب لگا لیجیے کہ شیخ کی قوتِ انکشاف کا کیا عالم ہوگا۔

★★★------------★★★------------★★★

چوتھا باب

شیخِ دیوبند جناب
مولوی حسین احمد صاحب (مدنی)
کے بیان میں

اس باب میں شیخ دیوبند جناب مولوی حسین احمد صاحب کے متعلق دیوبندی لٹریچر سے وہ واقعات وحالات جمع کیے گئے ہیں جن میں عقیدۂ توحید سے تصادم، اپنے مذہب سے انحراف اور منہ بولے شرک کو اپنے حق میں اسلام و ایمان بنا لینے کی شرم ناک مثالیں ورق ورق پر بکھری ہوئی ہیں۔ چشمِ انصاف کھول کر پڑھیے اور ضمیر کا فیصلہ سننے کے لیے گوش بر آواز رہیے۔

سلسلۂ واقعات

غیبی علم اور رُوحانی تصرف کی ایک حیرت انگیز کہانی:

روزنامہ ’الجمعیۃ‘ دہلی نے دیو بند کے مولوی حسین احمد صاحب کے حالات زندگی پر ’’شیخ الاسلام نمبر‘‘ کے نام سے ایک ضخیم کتاب شائع کی ہے۔ جمعیۃ العلما کا آرگن ہونے کی حیثیت سے اُس اخبار کو اپنی جماعت میں جو حسنِ اعتماد حاصل ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔

اسی شیخ الاسلام نمبر میں مولوی حسین احمد صاحب کے فرزند مولوی اسعد میاں کی روایت سے ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے۔ کرامات ومکاشفات کے عنوان کے ذیل میں اُنھوں نے لکھا ہے کہ:

’’غزالی صاحب دہلوی نے مدینہ طیبہ میں مجھ سے بیان کیا کہ میں دہلی کے ایک سیاسی جلسہ میں شریک ہوا۔ حضرت والا بھی اس میں شریک تھے۔ وہاں میں نے دیکھا کہ عورتیں بھی اسٹیج پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ دل میں خیال گزرا کہ وہ شخص کیا ولی ہوسکتا ہے جو ایسے مجمع عام میں جہاں عورتیں بھی موجود ہوں، شرکت کرے۔ یہ خیال آکر حضرت سے اس درجہ نفرت پیدا ہوئی کہ میں جلسہ سے چلا آیا۔

اس ہی شب خواب میں دیکھا کہ حضرت نے مجھے سینے سے لگالیا ہے چنانچہ اس ہی وقت میرا قلب ذاکر ہوگیا اور وہ نفرت عقیدت سے بدل گئی۔‘‘

(شیخ الاسلام نمبر، ص:۱۶۲)

ذرا اس واقعے میں عجائبات کی فراوانی ملاحظہ فرمایئے۔ یہ کتنی بڑی غیب دانی ہے کہ مجلس سے روٹھ کر چلے جانے والے ایک اجنبی شخص کے دل کا حال معلوم کیا، اور صرف معلوم ہی نہیں کیا بلکہ ایک پیکرِ

لطیف میں اپنے آپ کو منتقل کر کے خواب میں تشریف بھی لے آئے اور ایک ہی نشانے میں یہ دوسرا تصرف ملاحظہ فرمایئے کہ سینے پر ہاتھ رکھتے ہی اچانک وہ نفرت بھی عقیدت سے بدل گئی۔ اور تیسرا تماشا یہ کہ اسی وقت سے سونے والے کے دل کے لطائف بھی جاگ گئے۔

یہ ساری باتیں وہ ہیں کہ اگر ہم کسی نبی یا ولی کے حق میں اس طرح کا عقیدہ ظاہر کردیں تو الزامات کے بوجھ سے گردن ٹوٹ جائے۔

لیکن اپنے شیخ کا مرتبہ دوبالا کرنے کے لیے ایمان کا خون بھی کردیا جائے تو یہاں سب روا ہے۔

اپنی وفات کا علم:

مولوی ریاض احمد صاحب فیض آبادی صدر جمعیۃ علماے میسور نے اسی شیخ الاسلام نمبر میں مولوی حُسین احمد صاحب کے ساتھ اپنی آخری ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ وقتِ رخصت موصوف کی یہ گفتگو خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے:

’’میں نے کہا کہ حضرت ان شاء اللہ اختتامِ سال پر ضرور حاضر ہوں گا فرمایا کہہ دیا کہ ملاقات نہیں ہوگی، اب تو میدانِ آخرت ہی میں ان شاء اللہ ملو گے مجمع میرے جو قریب تھا۔ احقر کی معیت میں آبدیدہ ہوگیا۔ حضرت نے فرمایا کہ رونے کی کیا بات ہے؟ کیا مجھے موت نہ آئے گی؟ اس پر احقر نے الحاح کے ساتھ کچھ علم غیب اور زیادتی عمر پر بات کرنی چاہی۔ مگر فرطِ غم کے باعث بول نہ سکا۔‘‘

(شیخ الاسلام نمبر، ص:۱۵۶)

اس گفتگو کا حاصل سوائے اس کے اور کیا ہوسکتا ہے کہ مولوی حسین احمد صاحب کو کئی ماہ پیشتر اپنی موت کا علم ہوگیا تھا، اور ’’کہہ دیا کہ ملاقات نہیں ہوگی‘‘ یہ لب ولہجہ شک اور تذبذب کا نہیں یقین و اذعان کا ہے۔ ’’مجمع آب دیدہ ہوگیا‘‘ یہ جملہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ لوگوں کو سچ مچ اس خبر کا یقین ہوگیا۔

اس واقعہ میں جو چیز خاص طور پر محسوس کرنے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ موت کا علم یقینی، امورِ غیب ہی سے تعلق رکھتا ہے، لیکن قرآن کی کوئی آیت اور حدیث کی کوئی روایت نہ مولوی حُسین احمد صاحب کو اس علم کے خاموش ادعا سے روک سکی اور نہ ہی اس خبر پر ایمان لانے والوں کی راہ میں حائل ہوئی۔ اور اب اس کی اس طرح تشہیر کی جارہی ہے، جیسے دنیا کی کوئی مسلمہ حقیقت بن گئی ہو۔

(۳)

اس علم کا ایک قصہ کہ بارش کب ہوگی؟:

مولوی جمیل الرحمٰن سیوہاری مُفتی دارالعلوم دیوبند نے اسی شیخ الاسلام نمبر میں سہسپور ضلع بجنور کے ایک جلسہ کا ذکر کیا ہے جو کانگریس کی طرف سے منعقد کیا گیا تھا اور جس میں مولوی حُسین احمد صاحب بھی شریک تھے۔

انھوں نے لکھا ہے کہ عین وقت جلسہ سے کچھ پہلے اچانک آسمان ابر آلود ہوگیا موسم کا رنگ دیکھ کر منتظمین جلسہ سراسیمہ ہوئے، اب اس کے بعد کا قصہ خود واقعہ نگار کی زبانی سُنیے۔ لکھا ہے کہ:

''اسی دوران میں جامع الروایات غفرلہٗ (یعنی واقعہ نگار) کو جلسہ گاہ میں ایک برہنہ سر مجذوبانہ ہیئت کے غیر متعارف شخص نے علیحدہ لے جاکر ان الفاظ میں ہدایت کی کہ ''مولوی حسین احمد سے کہہ دو کہ علاقے کا صاحبِ خدمت میں ہوں اگر وہ بارش ہٹوانا چاہتے ہیں تو یہ کام میرے توسط سے ہوگا۔''

راقم الحروف اسی وقت خیمے میں پہنچا جس پر حضرت والا نے آہٹ پاکر وجہ معلوم فرمائی اور اس پیغام کو سُن کر ایک عجیب پُرجلال انداز میں بسترِ استراحت ہی سے ارشاد فرمایا۔ جایئے کہہ دیجیے!! بارش نہیں ہوگی۔''

(شیخ الاسلام نمبر، ص: ۱۴۷)

بسترِ استراحت ہی سے ارشاد فرمایا ''یہ جملہ بتا رہا ہے کہ انھوں نے ''بارش نہیں ہوگی'' کا حکم آسمان

کا رُخ دیکھ کر نہیں دیا تھا بلکہ اس حکم کے پیچھے اسی غیبی علم وادراک کا ادعا تھا جس کا تعلق امورِ غیب سے ہے۔ یعنی اپنے اُسی غیبی علم کے ذریعے اُنھوں نے آئندہ کا حال معلوم کرلیا تھا اور جزم ویقین کے ساتھ کہہ دیا کہ بارش نہیں ہوگی۔

یا پھر اس واقعے میں اس امر کا اظہار مقصود ہے کہ عالم کے تکوینی اختیارات اس مجذوب کے ہاتھ میں نہیں بلکہ میرے ہاتھ میں ہیں۔ میں بارش روکنا چاہوں تو بلاشرکتِ غیرے خود بھی اس کی قدرت رکھتا ہوں۔

بہر حال دونوں میں سے کوئی بات بھی ہو مذہبی معتقدات سے انحراف کی بدترین مثال ہے جیسا کہ دیوبندی مذہب کی بنیادی کتاب تقویۃ الایمان میں ہے:

''اسی طرح مینہ برسنے کے وقت کی خبر کسی کو نہیں حالانکہ اس کا موسم بھی بندھا ہوا ہے اور ان موسموں پر برستا بھی ہے اور سارے نبی اور بادشاہ اور حکیم اس کی خواہش بھی رکھتے ہیں سو اگر اس کا وقت معلوم کرنے کی کوئی راہ ہوتی تو کوئی البتہ پالیتا۔''

(تقویۃ الایمان، ص: ۲۲)

اس مقام پر پھر آپ کے ایمان کی وہ رگ چھیڑنا چاہتا ہوں جہاں سے غیرتِ عشق کو زندگی ملتی ہے۔ حق کے ساتھ انصاف کرنے میں کسی کی پاسداری نہ کیجیے گا۔

ایک طرف کاروبارِ عالم میں شیخ دیوبند کا کائنات گیر اختیار دیکھیے اور دوسری طرف عالمین کے آقا محمد رسول اللہ ﷺ کی شانِ محبوبیت پر ان حضرات کے تیشۂ قلم کی ضرب ملاحظہ فرمایئے:

''سارا کاروبارِ جہان کا اللہ ہی کے چاہنے سے ہوتا ہے، رسول کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔''

(تقویۃ الایمان، ص: ۵۸)

(۴)

مقدرات الٰہی میں اثر و رسوخ کا ایک عجیب واقعہ:

اسی شیخ الاسلام نمبر میں اسعد میاں نے اپنے ''بزرگوار'' کے متعلق سابر متی جیل کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب کہ مولوی حُسین احمد صاحب بھی اسی جیل میں نظر بند تھے اُنھوں نے لکھا ہے کہ اسی دوران جیل کے ایک قیدی کو پھانسی کی سزا ہو گئی۔ یہ سُن کر اس کا خون سوکھ گیا۔ منشی محمد حُسین نامی کسی قیدی کے ذریعے اس نے مولوی حسین احمد صاحب سے دعا کی درخواست کرائی۔ اب آگے کا واقعہ خود واقعہ نگار کی زبانی سُنیے۔ لکھا ہے کہ:

''منشی محمد حسین، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بہت سر ہوئے، فرمایا اچھا جا کر اس سے کہہ دو کہ وہ رہا ہو گیا۔ منشی محمد حُسین صاحب نے اس سے جا کر کہہ دیا کہ باپو نے کہہ دیا ہے کہ تو رہا ہو گیا دو ایک روز گزرنے کے بعد اس قیدی نے پھر بے چینی کا اظہار کیا کہ اب تک کوئی حکم نہیں آیا اور میری پھانسی میں چند ہی روز رہ گئے ہیں۔ منشی محمد حسین نے پھر آ کر عرض کیا تو فرمایا کہ میں نے تو کہہ دیا کہ وہ رہا ہو گیا۔ اس کے بعد اس قیدی نے پھر بے چینی کا اظہار کیا کہ اب تک کوئی حکم نہیں آیا اور میری پھانسی میں چند ہی روز رہ گئے ہیں۔ منشی محمد حسین نے پھر آ کر عرض کیا تو فرمایا کہ میں نے تو کہہ دیا کہ وہ رہا ہو گیا۔ اس کے بعد دو ایک یوم پھانسی کے رہ گئے تھے کہ اس کی رہائی کا حکم آ گیا۔''

(شیخ الاسلام نمبر، ص:۱۲۲)

دعا کی درخواست کے جواب میں ''رہا ہو جائے گا'' یہ ایک پُر اُمید جواب کی حیثیت سے تو سمجھ میں آ سکتا ہے۔ لیکن رہا ہونے سے قبل ''رہا ہو گیا'' یہ فقرہ اسی کی زبان سے نکل سکتا ہے جس کے ہاتھ میں قضا و قدر کا محکمہ ہو یا پھر عالم غیب کا سارا کاروبار جس کے پیش نظر ہو۔ اس کے سوا ایک دانش ور

کی زبان سے نکلے ہوئے اس جملے کی کوئی تاویل نہیں ہو سکتی۔

کاروبار عالم میں مولوی حسین احمد صاحب کا اختیار و تصرف ثابت کرنے کے لیے تو یہ واقعہ تراشا گیا ہے لیکن سلطانِ کونین ﷺ کے تصرف و اختیار کے سوال پر ان حضرات کے عقیدے کی زبان یہ ہے:

''جس کا نام محمد یا علی ہے وہ کسی چیز کا مختار نہیں۔''

(تقویۃ الایمان، ص:۴۲)

اب آپ ہی بتائیے کہ حق و باطل کی راہوں کا امتیاز محسوس کرنے کے لیے کیا اب بھی مزید کسی نشانی کی ضرورت باقی ہے؟

(۵)

ایک اور حیرت انگیز تماشا:

نگاہ پر بار نہ ہو تو ایک حیرت انگیز تماشا اور ملاحظہ فرمایئے۔ مولوی احمد حسین لاہر پوری نام کے ایک شخص نے اس شیخ الاسلام نمبر میں اپنی ایک عجیب و غریب سرگزشت لکھی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ ابتدائی ایام میں میری اکثر نمازیں فوت ہو جایا کرتی تھیں خاص طور پر فجر اور ظہر کی۔ لکھتے ہیں کہ پریشان ہو کر میں نے یہ شکایت حضرت شیخ کو لکھ کر بھیجی۔ اس پر انھوں نے تنبیہ فرمائی۔ اس کے بعد کا واقعہ خود موصوف کی زبانی سُنیے۔ بیان کرتے ہیں کہ:

''اس کے بعد میری یہ کیفیت ہو گئی کہ بلاناغہ فجر و ظہر کی نماز کے وقت خواب میں حضرت کو غصے کی حالت میں دیکھا کرتا تھا فرماتے تھے کہ کیوں نماز پڑھنے کا ارادہ نہیں ہے؟ میں گھبرا کر اُٹھ جاتا۔ یہ کیفیت تقریباً ایک ڈیڑھ ماہ رہی۔ جب اچھی طرح نماز کا پابند ہو گیا تو یہ کیفیت ختم ہو گئی۔''

(شیخ الاسلام نمبر، ص:۳۹)

سیکڑوں میل کی مسافت سے بالالتزام فجر اور ظہر کے وقت ہر روز کسی کو آ کر اُٹھا دینا جہاں باطنی

تصرف کا بہت بڑا کمال ہے وہاں اس عظیم قوت انکشاف کا بھی حامل ہے کہ سیکڑوں میل کے فاصلے سے وہ ہر روز یہ بھی معلوم کرلیا کرتے تھے کہ فلاں شخص سو رہا ہے اُس نے اب تک نماز نہیں پڑھی اور پھر جب وہ نماز کا پابند ہوگیا تو اُنھیں اس کی بھی خبر ہوگئی اور انھوں نے خواب میں آنا چھوڑ دیا۔

یہ واقعہ پڑھتے وقت ایک خالی الذہن آدمی بالکل یہ محسوس کرتا ہے کہ جیسے گھر ہی کے اندر ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں کسی سونے والے آدمی کو وہ نماز کے وقت اُٹھادیا کرتے تھے۔

دل کے خطرے پر مطلع ہونے کا ایک عجیب قصہ:

دہلی کے مولوی اخلاق حسین قاسمی اسی شیخ الاسلام نمبر میں بیان کرتے ہیں کہ حاجی محمد حسین گزک والے دہلی کے پنجابی برادری کے رئیس تھے۔ وہ حافظ قرآن بھی تھے لیکن اُنھیں قرآن اچھا یاد نہیں تھا۔ ایک بار کسی موقع پر مولوی حسین احمد صاحب نے اُنھیں حافظ صاحب کہہ کر پکارا، اب اس کے بعد کا واقعہ خود حاجی صاحب کی زبانی سنیے۔ بیان کرتے ہیں:

"حضرت کی زبانِ مبارک سے حافظ صاحب کا لفظ سُن کر سناٹے میں آگیا دل میں شرمندہ ہوا اور خیال آیا مجھے قرآنِ کریم اچھا یاد نہیں ہے یہ حضرت نے کیا فرمادیا، یہ خیال لے کر میں اندر جا کر بیٹھ گیا، بیٹھتے ہی حضرت نے فرمایا، حافظ صاحب میرا ذہن بھی خراب ہے بھورے رنگ کی ایک خاص چڑیا ہوتی ہے وہ کھایا کیجیے ذہن اچھا ہوجائے گا۔"

(شیخ الاسلام نمبر، ص:۱۶۳)

اس واقعے کا سب سے عبرت ناک حصہ مولوی اخلاق حسین قاسمی کا وہ تاثر ہے جو اُنہوں نے اس واقعے کی بابت ظاہر کیا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:

"راقم کہتا ہے حاجی صاحب کے دل میں جو خیال گزرا، حضرت مدنی کی قوت ایمانی نے اُسے محسوس کرلیا۔ اسے اصطلاح میں "کشف قلوب" کہتے ہیں۔"

(شیخ الاسلام نمبر، ص:۱۶۳)

یہ سوال دُہرانے کے لیے ہمیں اس سے زیادہ اور کوئی موزوں جگہ نہیں مل سکتی کہ دل کے چھپے ہوئے خطرے کو محسوس کرنے والی یہ قوت ایمانی ان حضرات کے تئیں خود پیغمبر اعظم ﷺ کے اندر موجود تھی یا نہیں؟ اگر موجود تھی تو عقیدے کی یہ زبان کس کے حق میں استعمال کی گئی ہے:

"اس بات میں بھی ان کو کچھ بڑائی نہیں کہ اللہ صاحب نے غیب دانی ان کے اختیار میں دے دی ہو کہ جس کے دل کے احوال جب چاہیں معلوم کرلیں۔"

(تقویۃ الایمان، ص:۳۰)

اب ایمان و دیانت کے اس خون کا انصاف میں آپ ہی کے ضمیر پر چھوڑتا ہوں کہ دیوبندی مذہب کے مطابق جو قوت ایمانی خدا نے اپنے پیغمبر کو نہیں بخشی وہ دیوبند کے شیخ الاسلام کو کیوں کر حاصل ہوگئی۔

(۶)

غیبی قوت ادراک اور باطنی تصرف کا ایک اور ایمان شکن واقعہ:

اب غیبی قوت ادراک اور باطنی تصرف کا ایک نہایت سنسنی خیز واقعہ سُنیے:

مولوی حُسین احمد صاحب کے ایک مُرید ڈاکٹر حافظ محمد زکریا نے اسی شیخ الاسلام نمبر میں اپنی ایک آپ بیتی نقل کی ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ ان کے ایک پیر بھائی سخت بیمار ہوئے، حالت نہایت سنگین ہوگئی، اب اس کے بعد کا واقعہ خود موصوف ہی کی زبانی سُنیے۔ لکھتے ہیں کہ:

"میں بحیثیت معالج بلایا گیا تو دیکھتا ہوں کہ جسم بالکل بے حس و حرکت ہے آنکھیں پتھرا گئی ہیں، آثارِ مرگ بظاہر نمایاں ہیں یہ منظر دیکھ کر میں پریشان اور بے چین ہوگیا، کہ ناگہاں مریض رفتہ رفتہ اپنا ہاتھ اُٹھا کر کسی کو سلام کرتا ہے۔ پھر کہتا ہے کہ حضرت یہاں تشریف رکھیے، کچھ ہی دیر بعد اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہے اور اپنے والد وغیرہ سے کہتا ہے کہ حضرت کہاں تشریف لے گئے؟ جواب میں لوگ کہتے ہیں کہ حضرت تو یہاں تشریف فرما نہیں تھے۔ وہ حیرت سے کہتا ہے کہ حضرت تو تشریف لائے تھے اور میرے چہرے اور بدن پر ہاتھ پھیر کر فرمایا کہ اچھے

ہو جاؤ گے گھبراؤ نہیں۔ (ڈاکٹر صاحب موصوف فرماتے ہیں) کہ ابھی میں بیٹھا ہی تھا کہ دیکھتا ہوں کہ بخار ایک دم غائب ہے اور وہ بالکل تندرست اچھا ہے۔"

(شیخ الاسلام نمبر، ص:۱۶۳)

اب اس کے بعد واقعات کے مرتب مولوی سلیمان اعظمی فاضل دیوبند کا یہ بیان خاص توجہ سے پڑھنے کے قابل ہے:

"جامع کہتا ہے کہ حضرت شیخ کی یہ ادنیٰ کرامت ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت کو اپنے منتسبین (مریدین) سے کیسا گہرا تعلق ہوتا تھا۔"

(شیخ الاسلام نمبر، ص:۱۶۳)

کیا سمجھے آپ؟ دراصل یہ بتانا چاہتے ہیں کہ "حضرت شیخ" کی تشریف آوری کا واقعہ اس مریض کے واہمہ کا کوئی تصرف نہیں تھا بلکہ حقیقتاً "حضرت شیخ" اس کے پاس تشریف لائے تھے اور چشمِ زدن میں شفایاب کر کے چلے گئے۔

ایک لمحے کے لیے ذرا خالی الذہن ہو کر سوچیے کہ اس واقعے کے ضمن میں کتنے سوالات سر اُٹھا رہے ہیں؟

پہلا سوال تو یہی ہے کہ اگر مولوی حُسین احمد صاحب کو علمِ غیب نہیں تھا تو انھوں نے سیکڑوں میل کی مسافت سے یہ کیوں کر معلوم کر لیا کہ ہمارا فلاں مرید علالت کے سنگین مرحلے سے گزر رہا ہے فوراً چل کر اس کی مدد کی جائے۔

اور **دوسرا سوال** یہ ہے کہ اس مریض کے پاس وہ خواب میں نہیں بلکہ عین بیداری کی حالت میں تشریف لائے اور وہ بھی ایک لطیف پیکر میں کہ اس مریض کے سوا آس پاس کے تمام لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل رہے۔ آخر جیتے جی یہ روح کی طرح ایک لطیف پیکر انھیں کہاں سے مل گیا؟

اور پھر شفا بخشی کی ذرا یہ قوتِ کرشمہ ساز بھی دیکھیے کہ اُدھر مسیحا نے ہاتھ پھیرا اور اِدھر بیمار نیم جاں نے آنکھیں کھول دیں۔

دیوبندی مذہب میں اگر ان چیزوں کا نام خدائی تصرف نہیں ہے تو صاحبِ تقویۃ الایمان

نے سیاہ لکیروں کے ذریعے خدائی اختیارات کی جو تصویر کھینچی ہے۔ وہ تصویر کس کی ہے؟

پھر انصاف و دیانت کی یہ کتنی دردناک پامالی ہے کہ غیبی قوتِ انکشاف اور تصرف و اختیار کا جو عقیدہ دیوبندی حضرات کے نزدیک رسولِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ثابت شدہ نہیں ہے، وہی ان کے شیخ کی ادنیٰ کرامت ہے۔

آواز دو غیرتِ حق کو! وہ کہاں مر گئی!

(۷)

ایک اور تہلکہ خیز کہانی:

غیبی قوتِ ادراک اور باطنی تصرفات کی اس سے بھی زیادہ ایک تہلکہ خیز کہانی ملاحظہ فرمایئے:۔

دیوبندی رہنما مُفتی عزیز الرحمٰن بجنوری نے "انفاس قدسیہ" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو مدینہ بک ڈپو بجنور سے شائع ہوئی ہے، وہ کتاب مولوی حسین احمد صاحب کے حالاتِ زندگی پر مشتمل ہے۔ موصوف نے اس کتاب میں مولوی حسین احمد صاحب کے کسی مرید کا ایک واقعہ نقل کیا ہے جو اُسے آسام کے ایک پہاڑی علاقے میں پیش آیا تھا۔ اب پوری کہانی اُنہی کے الفاظ میں سُنیے:

"بالی ندی مولوی بازار کے ایک صاحب آزادی سے قبل ڈھاکہ سے شیلانگ بذریعہ موٹر جا رہے تھے۔ صوبہ آسام کا اکثر حصہ پہاڑی ہے۔ اس میں موٹر یا بس چلنے کا جو راستہ ہے وہ بہت تنگ ہے فقط ایک گاڑی جا سکتی ہے، دوسری کی گنجائش نہیں۔ یہ صاحب حضرت کے مرید تھے جب نصف راستہ طے ہو گیا تو دیکھا کہ سامنے سے ایک گھوڑا بڑے زوروں سے آ رہا ہے۔ اس شخص اور دیگر تمام حضرات کو خطرہ پیدا ہوا کہ اب کیا ہوگا موٹر روک لی۔ لیکن اس کے باوجود بھی بڑی تشویش ہوئی کیوں کہ گھوڑا بلا سوار بڑی تیزی سے دوڑا آ رہا تھا۔

راوی کا کہنا ہے کہ اس شخص نے اپنے دل میں سوچا کہ اگر پیر و مرشد ہوتے دعا

کرتے، ابھی اتنا سوچا تھا کہ حضرت شیخ گھوڑے کی لگام پکڑ کر کہیں غائب ہو گئے۔"

(انفاس قدسیہ، ص:۱۸۶)

کہاں دیو بند اور کہاں آسام کی پہاڑی! درمیان میں سیکڑوں میل کا فاصلہ! لیکن دل میں خیال گذرتے ہی "حضرت" وہاں چشم زدن میں پہنچ گئے اور گھوڑے کی لگام تھام کر بجلی کی طرح غائب ہو گئے۔

سیکڑوں میل کے فاصلے سے دل کی زبان کا استغاثہ اُنھوں نے سُن لیا اور سُن ہی نہیں لیا بلکہ وہیں سے یہ بھی معلوم کر لیا کہ واقعہ کہاں درپیش ہے اور صرف معلوم ہی نہیں کر لیا بلکہ چشم زدن میں وہاں پہنچ بھی گئے اور پہنچ ہی نہیں گئے بلکہ اسپ صبا رفتار کی لگام پکڑ کر غائب بھی ہو گئے۔

اب حق پرستی کا نشان دنیا سے اگر مٹ نہیں گیا ہے تو تصویر کے پہلے رُخ میں دیو بندی مذہب کے جو اقتباسات نقل کیے گئے ہیں اُنھیں سامنے رکھ کر فیصلہ کیجیے کہ مولوی حسین احمد صاحب کی غیبی چارہ گری کا یہ قصہ کیا یہ اثر نہیں چھوڑتا کہ ان حضرات کے یہاں شرک کی یہ ساری بحثیں صرف انبیا و اولیا کی حرمتوں سے کھیلنے کے لیے ہیں ورنہ خالص عقیدۂ توحید کا جذبہ اس کے پیچھے کارفرما ہوتا تو شرک کے سوال پر اپنے اور بیگانے کی یہ تفریق کیوں روا رکھی جاتی ہے۔

غور فرمایئے! یہ سارے واقعات وہ ہیں جو غیبی ادراک اور تصرف کی وہ قوت چاہتے ہیں جسے دیو بندی حضرات کے نزدیک کسی مخلوق میں تسلیم کرنا شرک ہے۔ لیکن مبارک ہو! کہ "شیخ" کی محبت میں یہ شرک بھی اُنھوں نے اپنے حلق کے نیچے اُتار لیا۔

یا للعجب! کہ دیو بند کے یہ بُت تراش آزر آج توحید کے دعوے دار بنے ہوئے ہیں۔

وفات کے بعد لحد سے نکل کے دوست کے گھر آنا:

یہ قصہ تو حضرت شیخ کی حیات ظاہری کا تھا کہ بجلی کی طرح چمکے اور غائب ہو گئے اور لوگوں نے ماتھے کی آنکھوں سے اُنہیں دیکھ بھی لیا۔ لیکن اب وفات کے بعد اپنی لحد سے نکل کر تشریف لانے کا ایک حیرت انگیز واقعہ سُنیے۔

کچھ عرصہ ہوا دیو بند کے ترجمان ماہ نامہ دار العلوم میں مولوی ابراہیم صاحب بلیاوی کی

موت پر ایک نہایت سنسنی خیز خبر شائع ہوئی تھی مرض الموت کا عینی شاہد لکھتا ہے کہ جب مولوی ابراہیم صاحب کی موت کا وقت قریب ہوا تو اُنھوں نے اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے فرمایا:۔

"حضرت والد صاحب کھڑے ہیں تو ادب نہیں کرتا۔ حضرت مدنی کھڑے ہنس رہے ہیں اور بلا رہے ہیں۔ شاہ وصی اللہ صاحب آئے ہیں مجھ کو اُٹھاؤ۔"

(دار العلوم: بابت مارچ ۱۹۶۷ء ص:۳۷)

مولوی حسین احمد صاحب کو دیو بند کی سر زمین میں پیوند خاک ہوئے کافی عرصہ گزر گیا، اور شاہ وصی اللہ صاحب کا کیا کہنا کہ اُنھیں تو دفن ہونے کے لیے دو گز زمین بھی مُیسر نہیں آئی جہاز ہی سے وہ سمندر کی گود میں سُلا دیے گئے۔

اب سوال یہ ہے کہ ان حضرات کو علمِ غیب نہیں تھا تو مولوی حسین احمد صاحب کو دیو بند کے گورستان میں اور شاہ وصی اللہ صاحب کو سمندر کی تہوں میں کیوں کر خبر ہو گئی کہ مولوی ابراہیم پا بہ رکاب ہیں۔ اُنھیں چل کر اپنے ہمراہ لایا جائے، اور پھر اتنا ہی نہیں غیبی قوت ادراک کے ساتھ ساتھ اُن کے اندر حرکتِ ارادی کی یہ قدرت بھی تسلیم کر لی گئی کہ وہ عالم برزخ سے چل کر سیدھے مرنے والے کے بستر مرگ تک جا پہنچے اور اسے اپنے ہمراہ لیے ہوئے شہر خموشاں کی طرف واپس لوٹ گئے۔

اب ہماری مظلومی کے ساتھ انصاف کیجیے کہ علم و ادراک اور قدرت و اختیار کا یہی عقیدہ ہم اپنے آقائے برحق سید عالم ﷺ کے حق میں روا رکھتے ہیں تو دیو بند کے یہ "موحدین" ہمیں ابوجہل کے برابر مشرک سمجھنے لگتے ہیں۔

بھاگلپور سے ایک مرید کا بذریعۂ مراقبہ جنازے میں شریک ہونا:

اب تک تو بات چل رہی تھی خود حضرت "شیخ" کی۔ لیکن اب ان کے ایک مرید کی غیبی قوتِ ادراک کا کمال ملاحظہ فرمایئے۔

ضلع بھاگل پور کے کسی گاؤں میں حاجی جمال الدین نام کے کوئی مرید تھے۔ اُنھوں نے اسی شیخ الاسلام نمبر میں اپنے حضرت کی وفات کے بعد کا ایک حیرت انگیز قصہ بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

"میں حضرت کے وصال کے بعد شب جمعہ کو (واضح رہے کہ "حضرت" کا انتقال جمعرات کے دن ہوا تھا) بارہ تسبیح سے فراغت کے بعد کچھ دیر مراقب ہوکر بیٹھ گیا، کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت کا وصال ہوگیا ہے اور مجمع کثیر ہے اور حضرت کی نماز پڑھی جارہی ہے، میں بھی ان لوگوں کو دیکھ کر نمازِ جنازہ میں شریک ہوگیا، اس کے بعد لوگ حضرت کو قبرستان کی طرف لے چلے۔"

(شیخ الاسلام نمبر، ص:۱۹۳)

کتنا عجیب وغریب مراقبہ ہے کہ بغیر کسی "نامہ بر" کے حضرت کے وصال کی خبر بھی معلوم ہوگئی گھر بیٹھے بیٹھے آنکھوں سے جنازے کا مجمع بھی دیکھ لیا اور پلک جھپکتے وہاں پہنچ کر جنازے میں شریک بھی ہوگئے۔ واضح رہے کہ مراقبے کی حالت خواب کی حالت نہیں ہوتی بلکہ عین بیداری کی حالت ہوتی ہے۔

اب ایک طرف بے حجاب مشاہدات اور خدائی تصرفات کا یہ کھلا ہوا دعوئ ملاحظہ فرمایئے کہ درمیان کا حجاب اُٹھانے کے لیے حضرت جبرئیل امین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بھی کوئی احتیاج نہیں پیش آئی اور دوسری طرف نبی اعظم ﷺ کے حق میں ان حضرات کے عقیدے کا یہ نوشتہ پڑھیے کہ معاذاللہ سرکار کائنات ﷺ کو پس دیوار کی بھی خبر نہیں ہے اور ان کے علم و ادراک کا ہر گوشہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کا شرمندۂ احسان ہے۔

غیب دانی کے چند عجیب واقعات:

مفتی عزیز الرحمٰن صاحب بجنوری نے اپنی کتاب "انفاس قدسیہ" میں اپنے "حضرت" کی غیب دانی سے متعلق دو عجیب وغریب واقعے نقل کیے ہیں۔ ذیل میں پڑھیے اور توحید پرستی کے مقابلے میں "شیخ پرستی" کے جذبے کی فراوانی کا تماشا دیکھیے:

پہلا واقعہ

لکھتے ہیں کہ:

"رمضان المبارک کے موقعے پر بارہا ایسا ہوا کہ جس دن آپ سورۂ اِنَّا اَنْزَلْنَا

وتروں میں تلاوت فرماتے اسی دن شب قدر ہوتی تھی عید کی چاندرات کے بارے میں بھی بارہا تجربہ کیا ہے کہ جس دن چاندرات ہوتی تھی حضرت اسی دن صبح سے عید کا انتظام شروع کردیتے تھے اور ایک دن پیشتر قرآن شریف ختم کردیتے تھے، چاہے ۲۹ رتاریخ کیوں نہ ہو۔

حضرت کے اس طریقے کی بنا پر حضرت کا ہر خانقاہی بتاسکتا تھا کہ آج چاندرات ہے۔"

(انفاسِ قدسیہ، ص:۵۰)

"جس دن آپ سورۂ اِنَّا اَنْزَلْنَا وتروں میں تلاوت فرماتے اسی دن شب قدر ہوتی تھی" کا یہ مطلب نہ بھی لیا جائے کہ آپ کے تلاوت فرمادینے کی وجہ سے چاروناچار اس دن کو شب قدر ہونا پڑتا تھا۔ جب بھی یہ مفہوم اپنی جگہ پر قطعی متعین ہے کہ آپ کو شبِ قدر کا علم ہوجاتا تھا۔ حالانکہ اہلِ علم اچھی طرح جانتے ہیں کہ شبِ قدر مخلوق کے درمیان ایک سرِّ الٰہی کی طرح مستور رکھی گئی ہے۔ خود رسولِ پاک صاحبِ لولاک ﷺ نے بھی صراحت کے ساتھ اس کی تعیین نہیں فرمائی ہے، لیکن دیوبند کے یہ "حضرات" اپنی غیبی قوتِ ادراک کے ذریعے خدا کے حرم میں نقب ڈال کر یہ معلوم کرلیتے تھے کہ آج شب قدر ہے۔

اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ کئی دن پیشتر آپ پر یہ بھی منکشف ہوجاتا تھا کہ کس دن چاند نظر آئے گا اور پھر یہ علم اتنا یقینی ہوتا تھا کہ اپنے اسی علم کی بنیاد پر وہ خود بھی قبل از وقت عید کی تیاری شروع کردیتے تھے اور ان کی خانقاہ کے درویشوں کو بھی چاندرات معلوم کرنے کے لیے آسمان کی طرف دیکھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔

اپنے حضرت کے متعلق توحید کے علَم برداروں کا ذرا یہ ذہن ملاحظہ فرمایئے کتاب وسنت کی ساری ہدایات یہاں بے کار ہوگئیں، اب صرف "حضرت" کا جذبۂ عقیدت ہے اور وہ ہیں۔

دوسرا واقعہ

لکھتے ہیں کہ:

"مولوی اسحاق صاحب حبیب گنجی بیان فرماتے ہیں کہ ہر رمضان المبارک

کے موقعے پر آپ سلہٹ والوں کے اصرار پر سلہٹ تشریف لاتے تھے اس سلسلے میں سلہٹ کے ایک دوکان دار سے چندہ لینے کے لیے بات چیت ہوئی اس نے تُرش روئی سے گیارہ روپے چندہ دیا اور یہ لفظ کہا کہ، کیا یہ ٹیکس ہے؟

بہر حال وصول شدہ چندے کی ایک رقم حضرت کے پاس بھیج دی گئی، چند ہی روز بعد اس میں سے گیارہ روپے واپس آ گئے اور کوپن پر تحریر تھا کہ دوکان دار سے روپیہ لے کر روانہ کرنا مجھے پسند نہیں اس کو یہ روپیہ واپس دے دو۔"

(انفاسِ قدسیہ، ص:۱۸۶)

اللہ اکبر! کہاں سلہٹ کہاں دیو بند! لیکن واقعہ کی نوعیت پڑھ کر بالکل ایسا لگتا ہے کہ جیسے اُس دوکان دار کی ترش روئی کا واقعہ بالکل "حضرت" کے سامنے پیش آیا ہو۔

یہ ہے جذبۂ عقیدت کی کار فرمائی کہ جسے مان لیا، مان لیا۔

تیسرا واقعہ

دہلی کے مولوی عبدالوحید صدیقی نے "عظیم مدنی نمبر" کے نام سے اپنے اخبار نئی دُنیا کا ایک نمبر شائع کیا تھا۔ موصوف نے اپنے اس نمبر میں مولوی حسین احمد صاحب کی غیب دانی سے متعلق مراد آباد جیل کے دو واقعے نقل کیے ہیں جو ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"ایک دن حضرت کے نام پانوں کا پارسل آیا جس کا علم صرف بنرجی صاحب (جیلر) کو ہی تھا اور کسی شخص کو نہ تھا۔ موصوف نے وہ پارسل بہ نظر احتیاط روک لیا۔ تھوڑے عرصے کے بعد حسبِ معمول بارکوں کے معائنے کے لیے گئے۔ حضرت مدنی کے ساتھ اس وقت حافظ محمد ابراہیم صاحب اور دیگر حضرات تھے جیسے ہی جناب بنرجی صاحب حضرت کے سامنے آئے حضرت نے فرمایا کیوں صاحب! آپ نے میرا پانوں کا پارسل روک لیا ہے۔ خیر کچھ حرج نہیں، آج اس میں سے صرف چھ (۶) پان دے دیجیے، پرسوں تک دوسرا پارسل آ جائے گا۔

جناب بنرجی کو بڑا تعجب ہوا کہ اس واقعے کا علم حضرت کو کیسے ہوا موصوف نے چپکے سے پان لا کر حاضر کر دیے۔ حضرت نے اس میں سے صرف چھ (۶) عدد پان لے لیے اور بقیہ واپس فرما دیے۔ اور فرمایا میرا پان پرسوں تک آئے گا اس کو نہ روکیے گا۔ تیسرے روز حسبِ ارشاد پانوں کا پارسل آیا اب موصوف کو خیال ہوا کہ یہ کوئی معمولی شخص نہیں بلکہ کوئی پہنچے ہوئے فقیر معلوم ہوتے ہیں۔"

(روزنامہ نئی دنیا دہلی کا عظیم مدنی نمبر، ص:۲۰۸)

اسے کہتے ہیں ایک تیر میں دو نشانہ! گزشتہ کا حال بھی بتا دیا کہ میرا پانوں کا پارسل آیا ہوا تھا اُسے آپ نے روک لیا اور آئندہ کی بھی خبر دے دی کہ پرسوں تک میرا پانوں کا پارسل پھر آئے گا اُسے نہ روکیے گا۔

اب اس واقعے کے ذیل میں سب سے بڑا ماتم اس سنگ دلی کا ہے کہ یہاں گذشتہ اور آئندہ کا علم تو خدا تک پہنچے ہوئے فقیر کی علامت ٹھہرا لی۔ لیکن جس محبوب کی رسائی ذاتِ کبریا تک بلاواسطہ ہوئی، وہاں یہ علامت تسلیم کرتے ہوئے ان حضرات کو شرک کا آزار ستانے لگتا ہے۔

چوتھا واقعہ

اسی جیل کا دوسرا واقعہ موصوف بیان کرتے ہیں کہ:

"انہی دنوں جیل میں مولانا کے نام کہیں سے کوئی خط آیا تھا جس پر محکمہ سنسر کی مہر لگی ہوئی تھی، جیلر نے وہ خط مولانا کو دے دیئے۔ انسپکٹر جنرل کی طرف سے باز پرس ہوئی اسی جرم میں جیلر کو معطل کر دیا گیا۔

اس واقعہ کے فوراً بعد صاحب موصوف مولانا کی خدمت میں پہنچے دیکھتے ہیں مسکرا کر مولانا نے فرمایا پان جو دیے تھے اس سے معطل ہوئے پان نہ دیتے تو کیا ہوتا۔ ان کو سخت حیرت تھی کہ واقعہ ابھی ابھی دفتر میں ہوا ہے کسی کو خبر تک نہیں انہیں کیوں کر علم ہوا۔ انہوں نے اپنی پریشانی کا اظہار کیا تو ارشاد فرمایا انشاء اللہ

کل تک بحالی کا حکم آجائے گا، تم مطمئن رہو۔ ان کی حیرت کی انتہا نہ تھی۔

دوسرے دن ڈاک میں جو پہلی چیز ہاتھ میں آئی وہ معطلی کے حکم کی منسوخی اور بحالی تھی اس واقعہ سے بنرجی صاحب اور دیگر عہدے دارانِ جیل حضرت کے معتقد ہو گئے۔"

(نئی دنیا کا عظیم مدنی نمبر، ص:۲۰۸)

یہاں بھی ایک تیر میں دو نشانہ ہے، گذشتہ کی بھی خبر دے دی اور آئندہ کا بھی حال بتا دیا۔

یہ سوچ کر آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگتا ہے کہ جس کمال کو اپنے شیخ کے حق میں کافروں کے معتقد ہونے کا ذریعہ تسلیم کیا گیا اسی کمال کو جب مسلمان اپنے نبی کے حق میں تسلیم کرتے ہیں تو یہ انھیں مشرک سمجھنے لگتے ہیں۔

چوتھا باب جو شیخ دیوبند مولوی حسین احمد صاحب کے حالات و واقعات پر مشتمل تھا یہاں پہنچ کر تمام ہو گیا۔

اب آپ کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ "تصویر کے پہلے رُخ" میں جن اعتقادات کو ان حضرات نے انبیا و اولیا کے حق میں شرک قرار دیا تھا اپنے اور اپنے بزرگوں کے حق میں وہی اعتقاد عین اسلام کیوں کر بن گئے؟

تصویر کے پہلے رُخ میں اپنے جن معتقدات کا اظہار کیا گیا ہے یا تو وہ باطل ہیں یا پھر تصویر کے دوسرے رُخ میں جو واقعات نقل کیے گئے ہیں وہ غلط ہیں۔ ان دو باتوں میں سے جو بات بھی قبول کی جائے مذہبی دیانت، دینی اعتماد اور علمی ثقاہت کا خون ضروری ہے۔

غیرتِ حق کا جلال اگر نقطۂ اعتدال کی طرف لوٹ آیا ہو تو ورق اُلٹیے اور پانچویں باب کا مطالعہ کیجیے۔

------------------------***

پانچواں باب

اکابرِ دیوبند کے مرشد معظم
حضرت مولانا حاجی امداد اللہ صاحب تھانوی
کے بیان میں

اس باب میں حضرت شاہ حاجی امداد اللہ صاحب کے متعلق مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی، مولوی اشرف علی صاحب تھانوی اور مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی وغیرہم کی روایات سے وہ واقعات و حالات جمع کیے گئے ہیں، جو عقیدۂ توحید کے تقاضوں سے تصادم، مذہب سے انحراف اور منہ بولے شرک کو اپنے بزرگوں کے حق میں اسلام و ایمان بنا لینے کی شہادتوں سے بوجھل ہیں۔ چشمِ انصاف کھول کر پڑھیے اور ضمیر کی آواز سننے کے لیے گوش بر آواز رہیے!

سلسلۂ واقعات

(۱)

خبر رسانی کا ایک نیا ذریعہ:

حضرت شاہ امداد اللہ صاحب سے متعلق ذیل کے اکثر واقعات ''کراماتِ امدادیہ'' نامی کتاب سے اخذ کیے گئے ہیں۔ جو مولوی محمد قاسم نانوتوی، مولوی رشید احمد گنگوہی اور مولوی اشرف علی صاحب تھانوی وغیرہم کی روایات پر مشتمل ہے یہ کتاب کتب خانہ ہادی دیوبند سے شائع ہوئی ہے۔

اس کتاب میں حضرت شاہ صاحب کے ایک مرید مولانا محمد حسن صاحب اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ:

''ایک دن ظہر کے بعد میں اور مولوی منور علی اور مُلّا محب الدین صاحب کوئی ضروری بات عرض کرنے کو حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت حسب معمول اوپر جا چکے تھے، کوئی آدمی نہیں تھا کہ اطلاع کرائی جاتی، آواز دینا ادب کے خلاف تھا۔ آپس میں مشورہ کیا کہ حضرت کے قلب کی طرف متوجہ ہو کر بیٹھ جائیں بات کا جواب مل جائے گا یا حضرت خود تشریف لائیں گے۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ حضرت اوپر سے تشریف نیچے لائے، ہم لوگوں نے معذرت کی اس وقت حضرت لیٹے ہوئے تھے ناحق تکلیف ہوئی۔ ارشاد ہوا تم لوگوں نے لیٹنے بھی دیا؟ کیوں کر لیٹتا۔''

(کراماتِ امدادیہ، ص:۱۳)

دیکھ رہے ہیں آپ! مراقبہ ان حضرات کے یہاں خبر رسانی کا کتنا عام ذریعہ ہے، جب چاہا اور جہاں چاہا گردن جھکائی اور گفتگو کر لی یا حال معلوم کر لیا، نہ ادھر کوئی زحمت نہ اُدھر کوئی سوال کہ دل کے مخفی ارادوں پر کیوں کر اطلاع ہوئی، وائرلیس کی طرح ایک طرف سگنل دیا اور دوسری طرف وصول کر لیا۔

لیکن کتنی شرم ناک ہے دین میں یہ پاسداری کہ اپنے اور اپنے ''شیخ'' کے سوال پر شرک کے سارے ضابطے ٹوٹ گئے۔ اور جو بات نبی و ولی کے حق میں کفر تھی وہی اپنے شیخ کے حق میں کیوں کر اسلام بن گئی؟

(۲)

ایک مذہب شکن واقعہ:

اب اور دلچسپ واقعہ سُنیے!

مولوی مظفر حسین صاحب کاندھلوی دیوبندی جماعت کے مانے ہوئے بزرگوں میں ہیں۔ تھانوی صاحب ان کی روایت سے اپنے پیرو مرشد حضرت شاہ صاحب کا ایک عجیب وغریب واقعہ نقل کرتے ہیں کہ:

''حضرت مولانا مُظفر حسین صاحب مرحوم مکہ معظمہ میں بیمار ہوئے اور اشتیاق تھا مدینہ منورہ میں وفات ہو، حاجی صاحب سے استفسار کیا کہ میری وفات مدینہ منورہ میں ہوگی یا نہیں؟ حاجی صاحب نے فرمایا کہ میں کیا جانوں؟ عرض کیا حضرت! یہ عذر تو رہنے دیجیے جواب مرحمت فرمایئے۔ حاجی صاحب نے مراقب ہو کر فرمایا کہ آپ مدینہ منورہ میں وفات پائیں گے۔''

(قصص الاکابر، ص:۱۳۶، مصنف: مولوی اشرف علی تھانوی)

بتایئے! یہ آنکھوں سے لہو ٹپکنے کی بات ہے یا نہیں؟ نصف صدی سے یہ لوگ چیخ رہے ہیں کہ سوائے خدا کے کسی کو علم نہیں کہ کون کہاں مرے گا۔ یہاں تک کہ پیغمبر اعظم ﷺ کے علم غیب کے انکار میں

"وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ" والی آیت ان حضرات کی نوکِ زبان وقلم سے ہر وقت لگی رہتی ہے۔ حالانکہ وہ آیت اب بھی قرآنِ کریم میں موجود ہے، لیکن اپنے شیخ کے بارے میں ان حضرات کی خوش عقیدگی ملاحظہ فرمایئے کہ اُنھوں نے مراقبہ کرتے ہی ایک ایسی بات معلوم کرلی جو صرف خدا کا حق ہے اور اپنی مخلوق میں سے کسی کو بھی خدا نے یہ علم نہیں عطا فرمایا، جیسا کہ "فتح بریلی کا دلکش نظارہ" نامی کتاب میں دیوبندی جماعت کے معتمد وکیل مولوی منظور نعمانی تحریر فرماتے ہیں:

"وہ پانچ غیب (جن میں مرنے کی جگہ کا علم بھی شامل ہے) اُن کو حق تعالیٰ نے اپنے لیے خاص کرلیا ہے، ان کی اطلاع نہ کسی مقرب فرشتے کو دی نہ کسی نبی ورسول کو۔"

(قصص الاکابر، ص: ۸۵)

پھر مراقبہ اور قلبی توجہ کی یہ قوت جس نے چشم زدن میں پردۂ غیب کا ایک سربستہ راز معلوم کرلیا نبی عربی ﷺ کے حق میں یہ حضرات تسلیم نہیں کرتے۔ جیسا کہ یہی تھانوی صاحب جو اپنے پیر ومرشد کے حق میں اس عظیم قوت انکشاف کے خود قائل ہیں۔ اپنی کتاب حفظ الایمان میں سید کائنات ﷺ کی غیبی قوتِ ادراک پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بہت سے امور میں آپ کا خاص اہتمام سے توجہ فرمانا بلکہ فکر و پریشانی میں واقع ہونا ثابت ہے، قصۂ افک میں آپ کی تفتیش وانکشاف بالغ وجوہ صحاح میں مذکور ہے مگر صرف توجہ سے انکشاف نہیں ہوا بعد ایک ماہ وحی کے ذریعہ اطمینان ہوا۔"

(قصص الاکابر، ص: ۷)

تھانوی صاحب کا یہ بیان اگر صحیح ہے تو بظاہر اس کی دو ہی وجہ سمجھ میں آتی ہیں کہ یا تو حضور انور ﷺ کی غیبی قوت ادراک معاذ اللہ اتنی کمزور تھی کہ مخفی حقائق کی تہ تک پہنچنے سے قاصر رہ گئی یا پھر معاذ اللہ بارگاہِ خداوندی میں اُنھیں تقرب کا وہ درجہ حاصل نہیں تھا کہ توجہ کرتے ہی انکشاف ہوجاتا اور ایک ماہ فکر و پریشانی میں مبتلا رہنے کی نوبت نہ آتی۔ اور پھر اس قسم کا حادثہ ایک بار نہیں پیش آیا کہ اسے اتفاق پر محمول کرلیا جائے بلکہ تھانوی صاحب کے کہنے کے مطابق بہت سے اُمور

میں اس طرح کے حالات سے حضور کو گزرنا پڑا۔

اب آپ ہی فیصلہ کیجیے کہ اپنے رسول کے حق میں ذہن کی بے گانگی اور قلم کی بے وفائی کا کیا اس سے بھی بڑھ کر اور کوئی ثبوت چاہیے کہ اپنے شیخ کے علم کی تحسین اور رسول کے علم کی تنقیص دونوں کا مُصنف ایک ہی شخص ہے اور پھر اس واقعہ میں حسنِ اعتقاد کا سب سے دلچسپ تماشا تو یہ ہے کہ جب شاہ صاحب نے قرآن کی آیت کے بموجب اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو اس پر وہ خاموش نہیں ہوگئے بلکہ یہ کہہ کر کہ "یہ عذر تو رہنے دیجیے" ان کی غیب دانی کے متعلق اپنے دل کے یقین کا بالکل نقاب اُلٹ دیا۔

اب اس کا فیصلہ آپ ہی کیجیے کہ بالکل ایک ہی طرح کے مقدمہ میں ان حضرات کے یہاں سوچنے کا انداز اپنے اور بے گانے کی طرح کیوں ہے؟

(۳)

روئے زمین کے علمِ محیط کا ایک عجیب واقعہ:

اب ایک بہت ہی پُر لطف اور حیرت افزا قصہ سُنیے۔ شاہ صاحب کے خاص مریدوں میں مولوی محمد اسمٰعیل نامی ایک صاحب گزرے ہیں۔ کراماتِ امدادیہ میں وہ اپنے بھائی کی زبانی عجیب وغریب واقعہ نقل کرتے ہیں کہ:

"میں نے اپنے برادرِ معظم حاجی عبدالحمید صاحب سے سُنا ہے کہ ایک دفعہ مولوی محی الدین صاحب فرماتے تھے کہ چونکہ حضرت حاجی صاحب عرصۂ دراز سے بوجہ ضعف بدن کے حج کرنے سے معذور تھے ہم نے ایک دوست سے کہا کہ آج خاص یومِ عرفات (یعنی یومِ حج ہے) دیکھنا چاہیے کہ حضرت کہاں ہیں؟ اُنھوں نے مراقب ہوکر دیکھا کہ حضرت جبلِ عرفات کے نیچے تشریف رکھتے ہیں۔ ہم لوگوں نے بعد کو عرض کیا کہ آپ یومِ عرفات میں کہاں تھے؟ حضرت نے کہا کہیں بھی نہیں مکان پر تھا۔ ہم لوگوں نے عرض کیا حضرت آپ تو فلاں جگہ تشریف رکھتے

تھے۔ حضرت نے فرمایا، یا اللہ! لوگ کہیں بھی چھپا نہیں رہنے دیتے۔"

(کراماتِ امدادیہ، ص:۲۰)

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ شاہ صاحب نے غلط طور پر کہہ دیا کہ وہ مکان پر تھے اس لیے شاہ صاحب کو غلط بیانی کے الزام سے بچانے کے لیے یہ ماننا پڑے گا کہ اس دن وہ مکان پر بھی تھے اور جبلِ عرفات کے نیچے بھی۔

لیکن اپنے شیخ کے حق میں دل کی وارفتگی کا یہ تصرف یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ایک وجود کو متعدد مقامات میں موجود تصور کرتے ہوئے نہ اُنھیں عقل کا کوئی استحالہ نظر آیا اور نہ قانون شریعت کی کوئی خلاف ورزی محسوس ہوئی اور پھر داد دیجیے ان تلاش کرنے والوں کو جو گھر بیٹھے سارا جہان چھان آئے اور بالآخر جبلِ عرفات کے نیچے اپنے شیخ کو پالیا۔ اسے کہتے ہیں علم وادراک کی غیبی توانائی جو خانقاہ امدادیہ کے درویشوں کو تو حاصل ہے لیکن دیوبندی مذہب میں سید الانبیا ﷺ کو حاصل نہیں ہے۔

اور شاہ صاحب کا یہ جواب کہ "یا اللہ! لوگ کہیں بھی چھپا نہیں رہنے دیتے۔" مریدین و متوسلین کی غیب دانی کے ثبوت کے لیے ایک الہامی دستاویز سے کم نہیں ہے۔

ایمان کی بوجھل شہادتوں کو گواہ بنا کر کہیے کہ حق وباطل کی راہوں کا امتیاز محسوس کرنے کے لیے کیا اب بھی کسی مزید نشانی کی ضرورت باقی ہے؟

(۴)

عقیدۂ توحید سے ایک خوں ریز تصادم:

نگاہ پر بوجھ نہ ہو تو عقیدۂ توحید کے ساتھ خوں ریز تصادم کا ایک واقعہ پڑھیے۔ اسی کراماتِ امدادیہ میں بیان کیا گیا ہے کہ ان ہی شاہ صاحب کے ایک مرید کسی بحری جہاز سے سفر کر رہے تھے ایک تلاطم خیز طوفان میں جہاز گھر گیا۔ قریب تھا کہ موجوں کے ہولناک تصادم سے اس کے تختے پاش پاش ہو جائیں۔

اب اس کے بعد کا واقعہ خود راوی کی زبانی سنیے۔ لکھا ہے کہ:

"اُنھوں نے دیکھا کہ اب مرنے کے سوا چارہ نہیں ہے۔ اسی مایوسانہ حالت میں گھبرا کر اپنے پیر روشن ضمیر کی طرف خیال کیا کہ اس وقت سے زیادہ اور کون سا وقت امداد کا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ سمیع وبصیر وکارساز مُطلق ہے۔ اسی وقت آگبوٹ غرق سے نکل گیا اور تمام لوگوں کو نجات ملی۔

اِدھر تو یہ قصہ پیش آیا، اُدھر اگلے روز مخدوم جہاں اپنے خادم سے بولے ذرا میری کمر دباؤ نہایت درد کرتی ہے، خادم نے کمر دباتے دباتے پیراہن مبارک جو اُٹھایا تو دیکھا کہ کمر چھلی ہوئی ہے اور اکثر جگہ سے کھال اُتر گئی ہے پوچھا حضرت یہ کیا بات ہے؟ کمر کیوں چھلی؟ فرمایا کچھ نہیں۔ پھر پوچھا، آپ خاموش رہے، تیسری مرتبہ پھر دریافت کیا۔ حضرت یہ تو کہیں رگڑ لگی ہے اور آپ تو کہیں تشریف بھی نہیں لے گئے۔ فرمایا ایک آگبوٹ ڈوبا جاتا تھا۔ اس میں ایک تمہارا دینی سلسلے کا بھائی تھا۔ اس کی گریہ وزاری نے مجھے بے چین کر دیا۔ آگبوٹ کو کمر کا سہارا دے کر اوپر کو اُٹھایا، جب آگے چلا اور بندگانِ خدا کو نجات ملی، اسی سے چھل گئی ہوگی اور اسی وجہ سے درد ہے۔ مگر اس کا ذکر نہ کرنا۔"

(کراماتِ امدادیہ، ص:۱۸)

قبیلے کے شیخ کی غیبی قوتِ ادراک اور خدائی اختیار وتصرف کا تو یہ حال بیان کیا جاتا ہے کہ اُنھوں نے ہزاروں میل کی مسافت سے دل کی زبان کا خاموش استغاثہ سُن لیا اور سُن ہی نہیں لیا بلکہ فوراً ہی یہ بھی معلوم کر لیا کہ سمندر کی ناپیدا کنار وسعتوں میں حادثہ کہاں پیش آیا ہے اور معلوم ہی نہیں کر لیا بلکہ چشم زدن میں وہاں پہنچ بھی گئے اور جہاز کو طوفان سے نکال کر واپس لوٹ آئے۔ لیکن وائے رے دلِ حرماں نصیب کی شرارت! کہ رسول کونین ﷺ کے حق میں ان حضرات کے عقیدے کی زبان یہ ہے:

"یہ جو بعضے لوگ اگلے بزرگوں کو دور دور سے پکارتے ہیں اور اتنا ہی کہتے ہیں کہ یا حضرت! تم اللہ کی جناب میں دعا کرو کہ وہ اپنی قدرت سے ہماری حاجت

روا کرے اور پھر یوں سمجھتے ہیں کہ ہم نے کچھ شرک نہیں کیا ہے اس واسطے کہ ان
سے حاجت نہیں مانگی بلکہ دعا کرائی ہے، یہ بات غلط ہے اس واسطے کہ گو مانگنے کی
راہ سے شرک نہیں ثابت ہوا لیکن پکارنے کی راہ سے ثابت ہو جاتا ہے۔"

(تقویۃ الایمان، ص: ۲۳)

لیکن یہاں تو مانگنا بھی ہوا اور پکارنا بھی، دو دو شرک جمع ہو جانے کے باوجود توحید پر ان حضرات کی اجارہ داری اب تک قائم ہے اور ہم صرف اس لیے مشرک ہیں کہ جن اعتقادات کو وہ اپنے گھر کے بزرگوں کے حق میں روا رکھتے ہیں۔ انہی کو رسولِ کونین، شہیدِ کربلا، غوثِ جیلانی اور خواجۂ خواجگان چشت کے حق میں اپنے جذبۂ عقیدت کا معمول بنالیا ہے۔ اسی کا نام اگر شرک ہے تو اس الزام کا ہم صمیمِ قلب کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں کہ ساری اُمت کا مسلک یہی ہے۔

یہ پانچواں باب جو حضرت شاہ امداد اللہ صاحب تھانوی کے حالات و واقعات پر مشتمل تھا یہاں پہنچ کر تمام ہو گیا۔

تصویر کے دونوں رخوں کو مُنصفانہ جائزہ لینے کے بعد آپ واضح طور پر یہ محسوس کریں گے کہ ان حضرات کے یہاں دو طرح کی شریعتیں متوازی طور پر چل رہی ہیں۔ ایک تو انبیا و اولیا کے حق میں ہے اور دوسری اپنے بزرگوں کے حق میں!

ایک ہی عقیدہ جو پہلی شریعت میں کفر ہے، شرک ہے اور ناممکن ہے۔ وہی دوسری شریعت میں اسلام ہے، ایمان ہے اور امرِ واقعہ ہے۔

ضمیر کا یہ چیختا ہوا مطالبہ اب کسی مصلحت کے اشارے پر دبایا نہیں جا سکتا کہ دو شریعتوں کا اسلام ہرگز وہ اسلام نہیں ہو سکتا جو خدا کے آخری پیغمبر کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے۔

غیرتِ حق کا جلال اگر نقطۂ اعتدال کی طرف واپس لوٹ آیا ہو تو ورق اُلٹیے اور اس طلسم فریب کے عجائبات کا باقی حصہ بھی دیکھ لیجیے۔

حسرتِ دید کی آنکھوں کو نہ شکوہ رہ جائے ۔۔۔ صبح کے ساتھ چلو شام بھی ان کی دیکھیں

★★★------------★★★------------★★★

چھٹا باب

متفرقات کے بیان میں

اس باب میں دیوبندی جماعت کے مختلف مشاہیر و اکابر کے حالات و واقعات انہی حضرات کے لٹریچر سے جمع کیے گئے ہیں۔ جن میں عقیدۂ توحید سے تصادم، اپنے مذہب سے انحراف اور منہ بولے شرک کو اپنے حق میں اسلام و ایمان بنا لینے کی سازشوں کے ایسے نمونے آپ کو ملیں گے کہ آپ حیران و ششدر رہ جائیں گے۔

سلسلۂ واقعات

مولوی محمد یعقوب صاحب صدر مدرس مدرسہ دیوبند کا قصّہ

(۱)

کشف وغیب دانی کی ایک طویل داستان:

روزنامہ الجمعیۃ دہلی نے ''خواجہ غریب نواز نمبر'' کے نام سے ایک نمبر شائع کیا ہے۔ اس میں قاری طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ مولوی محمد یعقوب صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے قاری صاحب موصوف لکھتے ہیں: ''حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند کے اوّلین صدر مدرس تھے۔ نہ صرف عالمِ ربانی بلکہ عارف باللہ صاحب کشف و کرامت اکابر میں سے تھے۔ ان کے بہت سے مکشوفات اکابر مرحومین کی زبانی سُننے میں آئے ہیں۔ حضرت مولانا پر جذب کی کیفیت تھی اور بعض دفعہ مجذوبانہ انداز سے جو کلمات زبان سے نکل جاتے تھے وہ من وعن واقعات کی صورت میں سامنے آجاتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند کی درس گاہ کلاں موسوم بہ نودرہ کے وسطیٰ ہال میں حضرت مرحوم کی درس گاہ حدیث تھی۔ نودرہ کے وسطیٰ در کے سامنے والی ایک جگہ کے بارے میں فرمایا کہ جس کی نمازِ جنازہ اس جگہ ہوتی ہے وہ مغفور ہوتا ہے۔ (یعنی بخش دیا جاتا ہے)

(خواجہ غریب نواز نمبر، ص:۵)

یہ تو ایک دیوانے کی بات تھی لیکن اب دانشوروں کے ایمان ویقین کا عالم ملاحظہ فرمایئے۔ لکھتے ہیں کہ:

''عموماً اس وقت دارالعلوم میں جتنے جنازے متعلقین دارالعلوم یا شہر کے حضرات کے آتے ہیں اسی جگہ لاکر رکھے جانے کا معمول ہے۔ احقر نے سمینٹ سے اس جگہ کو مشخص (ممتاز) کرادیا ہے۔

(خواجہ غریب نواز نمبر، ص:۵)

بزرگانِ دین کے ایصالِ ثواب کے لیے کسی وقت کی تخصیص یا ذکر و بیان کے لیے کسی دن کے تعین پر تو یہ حضرات بدعت وحرام کا شور مچاتے ہیں لیکن یہاں ان سے اب کوئی نہیں پوچھتا کہ جنازے کی نماز تو دارالعلوم کے سارے احاطوں میں ہوسکتی ہے لیکن ایک خاص جگہ کی تخصیص اور اس پر عمل درآمد کا یہ اہتمام کیا بدعت نہیں ہے؟

بہرحال ضمنی طور پر درمیان میں یہ بات نکل آئی، اب پھر اسی سلسلۂ بیان کی طرف متوجہ ہوجایئے۔ فرماتے ہیں:

''اس مجذوبیت کے سلسلہ میں مولانا کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ میں ناقص رہ گیا ہوں۔ حضرت پیر و مرشد حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ تو مکہ میں ہیں وہاں جانا مشکل ہے لیکن میری تکمیل دونوں بزرگ حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی کرسکتے ہیں۔ اس لیے بار باران سے فرماتے کہ بھائی میری تکمیل کراؤ۔ یہ حضرات جواب دیتے کہ اب آپ میں کوئی کمی نہیں ہے اور جتنی کچھ بھی ہے سو وہ مدرسۂ دیوبند میں حدیث پڑھانے ہی سے پوری ہوجائے گی۔ اس لیے آپ درسِ حدیث میں مشغول رہیں یہی درس آپ کی تکمیل کا ضامن ہے۔ اس پر خفا ہوتے کہ یہ دونوں بُخل کرتے ہیں۔ سب کچھ لیے بیٹھے ہیں اور میرے حق میں بخل کررہے ہیں۔

(خواجہ غریب نواز نمبر، ص:۵)

اس کے بعد لکھا ہے کہ ادھر سے مایوس ہوجانے کے بعد انھوں نے اجمیر شریف حاضری کا ارادہ کرلیا کہ خواجہ غریب نواز کے حضور میں اپنی تکمیل کرسکیں۔ چنانچہ ایک دن وہ اسی جذبۂ شوق میں اُٹھے

اور اجمیر شریف کے لئے روانہ ہوگئے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے روضۂ خواجہ کے قریب ایک پہاڑی پر اپنی کٹیا بنائی اور وہیں قیام پذیر ہوگئے۔

لکھا ہے کہ اکثر مزار شریف پر حاضر ہوکر دیر تک مراقب رہتے ایک دن مراقبے میں حضرت خواجہ کی طرف سے ارشاد ہوا:

"آپ کی تکمیل مدرسۂ دیوبند میں حدیث پڑھانے ہی سے ہوگی۔ آپ وہیں جائیں اور ساتھ ہی حضرت خواجہ کا یہ مقولہ بھی منکشف ہوا کہ آپ کی عمر کے دس سال رہ گئے ہیں اس میں یہ تکمیل ہوجائے گی۔"

(خواجہ غریب نواز نمبر، ص:۶)

لکھا ہے کہ اس واقعے کے دوسرے ہی دن وہ اجمیر سے واپس ہوئے اور سیدھے اپنے وطن مالوف نانوتہ پہنچے۔ وہاں سے پھر گنگوہ کا قصد کیا۔ حضرت گنگوہی حسبِ معمول اپنی خانقاہ میں تشریف فرما تھے۔ کسی نے خبر دی کہ مولانا محمد یعقوب صاحب آرہے ہیں۔ حضرت نام سنتے ہی چارپائی سے کھڑے ہوگئے۔ اب اس کے بعد کا واقعہ خود قاری صاحب موصوف کی زبانی سُنیے۔ لکھا ہے کہ:

"جب مولانا محمد یعقوب صاحب قریب آگئے تو بلا کسی گفتگو کے سلام علیک کے بعد حضرت گنگوہی نے فرمایا: "ہم پہ کچھ احسان نہیں ہے ہم پہ کچھ احسان نہیں ہے۔" خدام بھی تو وہی بات کہہ رہے تھے جو حضرت خواجہ نے فرمائی ہے۔

مگر چھوٹوں کی کون سُنتا ہے؟ جب اوپر سے بھی وہی کہا گیا جو خدام عرض کیا کرتے تھے تب آپ نے قبول فرمایا۔"

(خواجہ غریب نواز نمبر، ص:۶)

مذہبی مزاج کے خلاف ہونے کے باوجود یہ واقعہ صرف اس لیے بار پا گیا ہے کہ اس سے مدرسۂ دیوبند کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، ورنہ جہاں تک خواجہ غریب نواز کے روحانی اقتدار اور غیبی تصرف پر یقین واعتماد کا تعلق ہے تو یہ حضرات نہ صرف یہ کہ اس کے منکر ہیں بلکہ اس کے خلاف جہاد کرنا اپنے دین کا اولین فریضہ سمجھتے ہیں جیسا کہ گذشتہ اوراق میں اس طرح کے کئی حوالے آپ کی

نظر سے گزر چکے ہیں۔

بہر حال کسی بھی جذبے کے زیرِ اثر یہ واقعہ صفحۂ قرطاس پر آیا ہو ہم قاری صاحب موصوف سے چند سوالات پر اپنے دل کا اطمینان ضرور چاہیں گے:-

پہلی بات تو یہی ہے کہ خواجہ غریب نواز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اگر علمِ غیب نہیں تھا تو انھیں کیوں کر معلوم ہوگیا کہ دیوبند میں ایک مدرسہ ہے جہاں حدیث کا درس دیا جاتا ہے اور مولوی محمد یعقوب وہاں سے درسِ حدیث چھوڑ کر ہمارے یہاں آئے ہیں۔

اور **دوسری بات** یہ ہے کہ انھیں یہ خبر کیوں کر ہوگئی کہ آنے والا منزلِ سلوک کی تکمیل کے لیے آیا ہے اور اس کی تکمیل یہاں نہیں ہوگی، مدرسۂ دیوبند میں ہوگی۔

اور **تیسری بات** تو نہایت تعجب خیز ہے کہ انھیں یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ان کی عمر کے دس سال باقی رہ گئے ہیں اور اس مدت میں تکمیل ہوجائے گی۔

اور **چوتھی بات** تو سب سے زیادہ حیرت انگیز ہے کہ مراقبہ میں جو بات خواجہ غریب نواز نے مولوی یعقوب صاحب سے فرمائی تھی بغیر کسی اطلاع کے مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی کو اس کی خبر کیوں کر ہوگئی؟ لیکن سب سے بڑا ماتم تو اس ستم ظریفی کا ہے کہ اتنے شرکیات کے ساتھ مصالحت کرنے کے باوجود یہ حضرات توحید کے تنہا اجارہ دار ہیں اور ہمارے لیے مشرک، قبر پرست، اور بدعتی کے القاب تراشے گئے ہیں۔ لیکن آستینوں سے لہو ٹپکنے کے بعد قتل کا چھپانا بہت مشکل ہے۔

----------★★★----------

(۲)

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدّث دہلوی کے قصّے

شکمِ مادر سے غیبی ادراک:

مولوی حافظ رحیم بخش صاحب دہلوی نے "حیات ولی" کے نام سے حضرت شاہ صاحب قبلہ کی سوانح حیات لکھی ہے اس میں ان کی ولادت سے قبل کا ایک نہایت حیرت انگیز واقعہ نقل کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

"ابھی مولانا شاہ ولی اللہ صاحب والدۂ محترمہ کے بطن مبارک ہی میں تشریف رکھتے تھے کہ ایک دفعہ (ان کے والد بزرگوار) جناب شیخ عبدالرحیم صاحب کی موجودگی میں ایک سائلہ آئی۔ آپ نے روٹی کے دو حصے کر کے ایک اُسے دیا اور ایک رکھ دیا۔

لیکن جوں ہی سائلہ دروازہ تک پہنچی شیخ صاحب نے دوبارہ بلایا اور بقیہ حصہ بھی عنایت کر دیا اور جب وہ چلنے لگی تو پھر آواز دی اور جس قدر روٹی گھر میں موجود تھی سب دے دی۔ اس کے بعد گھر والوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ پیٹ والا بچہ بار بار کہہ رہا تھا کہ جتنی روٹی گھر میں ہے سب اس محتاج مسکین کو راہِ خدا میں دے دو۔"

(حیاتِ ولی، ص:۳۹۷)

گویا شاہ صاحب بطن مادر ہی سے دیکھ رہے تھے کہ روٹی کا ایک حصہ بچا کر گھر میں رکھ لیا گیا ہے اور جب ان کے کہنے پر باقی حصہ بھی ان کے والد نے دے دیا تو اُسے بھی اُنھوں نے دیکھ لیا اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم کر لیا کہ گھر میں ابھی اور روٹیاں رکھی ہوئی ہیں، جب اُن کے کہنے پر سب کا سب دے ڈالا تب وہ خاموش ہوئے ۔

رسول عربی ﷺ کے علم و مشاہدہ پر تو سیکڑوں سوالات اُٹھائے جاتے ہیں لیکن یہاں کوئی نہیں پوچھتا کہ ایک جنین بچّے کے سر میں وہ کون سی آنکھ تھی جس نے پردۂ شکم سے دیواروں اور گھر کے برتنوں میں شگاف ڈال کر سارا چھپا ہوا حال دیکھ لیا۔

----------★★★----------

(۳)

حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کا قصہ

زمین کی وسعتیں احاطۂ نظر میں:

خود شاہ صاحب کی زبانی حیاتِ ولی کا مصنف ان کے والد ماجد کی غیبی قوتِ ادراک کا

ایک عجیب وغریب قصہ نقل کرتا ہے۔ لکھا ہے کہ:

"ایک دفعہ محمد قلی، اورنگ زیب کے لشکر میں کسی سمت روانہ ہوا تھا۔[1] چونکہ زمانہ دراز تک اس کی کوئی خبر عزیز و اقرباء کو نہیں ملی اس لیے اس کی اس مفقود الخبری نے بالخصوص اس کے برادر محمد سُلطان کو سخت بے چین کر دیا اور جب وہ بہت ہی بے تاب ہوا تو شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر التجا کی کہ اس گمشدہ کی خبر دیں۔

شیخ فرماتے ہیں کہ میں نے توجہ کی اور ہر چند کہ اسے لشکر کے ایک ایک خیمے میں ڈھونڈا لیکن کہیں سراغ نہ ملا۔ اموات کے زمرے میں تلاش کیا وہاں بھی پتہ نہ لگا۔ ازاں بعد میں نے لشکر کے اردگرد غور میں ڈوبی ہوئی نظروں سے دیکھا معلوم ہوا کہ غسل صحت پا کر شُتری (بھورے) رنگ کے لباس زیب بدن کیے ہوئے ایک کُرسی پر جلوہ آرا ہے اور وطن مالوف میں آنے کا تہیّہ کر رہا ہے، چنانچہ میں نے اس کے بھائی سے بیان کیا کہ محمد قلی زندہ ہے اور دو تین مہینے میں آیا چاہتا ہے۔ چنانچہ جب وہ آیا تو بجنسہٖ یہی قصہ بیان کیا۔"

(حیاتِ ولی، ص:۲۷۲)

اب آپ ہی ایمان و انصاف سے فیصلہ کیجیے کہ یہ واقعہ پڑھنے کے بعد کیا کسی بھی رُخ سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ زمین کی وسعتوں میں یہ جادہ پیمائی، اور لشکر میں پہنچ کر ایک ایک خیمے کی خانہ تلاشی، پھر وہاں سے مُردوں کے ڈھیر کی چھان بین، پھر اردگرد کے میدانوں میں جستجو، یہ ساری مہم اُنھوں نے وہاں جا کر نہیں بلکہ دہلی میں بیٹھے بیٹھے غیبی قوتِ ادراک کی مدد سے انجام دی تھی۔ لیکن سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے کہ غیبی قوتِ ادراک اور رُوحانی تصرف کا جو کمال یہ حضرات ایک ادنیٰ اُمّتی کے لیے بے چوں و چرا تسلیم کر لیتے ہیں اُسی کو رسول عربی ﷺ کے حق میں شرک کہتے ہوئے اُنھیں کوئی تامل نہیں ہوتا۔

----------★★★----------

(۴)

حضرت شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی کا قصّہ

کشف وغیب دانی کا ایک نہایت حیرت انگیز واقعہ:

دیوبندی جماعت کا معتمد راوی شاہ امیر خاں نے شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی کے کشف وغیب دانی کے متعلق اپنی کتاب 'ارواحِ ثلٰثہ' میں ایک نہایت حیرت انگیز واقعہ نقل کیا ہے۔ بیان کرتے ہیں کہ:

"اگر عید کا چاند تیس کا ہونے والا ہوتا تو شاہ عبدالقادر صاحب اول روز تراویح میں ایک سپارہ پڑھتے اور اگر انتیس کا چاند ہونے والا ہوتا تو اول روز دو سپارے پڑھتے۔ چونکہ اس کا تجربہ ہو چکا تھا۔ اس لیے شاہ عبدالعزیز صاحب اول روز آدمی کو بھیجتے تھے کہ دیکھ کر آؤ میاں عبدالقادر نے آج کتنے سپارے پڑھے ہیں؟ اگر آدمی کہتا کہ آج دو پڑھے ہیں تو شاہ صاحب فرماتے کہ عید کا چاند تو انتیس ہی کا ہوگا، یہ بات دوسری ہے کہ اَبر وغیرہ کی وجہ سے دکھائی نہ دے اور حجت رویت نہ ہونے کی وجہ سے رویت کا حکم نہ لگا سکیں۔

اس میں مولوی محمود حسن صاحب (دیوبندی) یہ اضافہ فرماتے تھے کہ یہ بات دہلی میں اس قدر مشہور ہو گئی تھی کہ اہل بازار اور اہل پیشہ کے کاروبار اس پر مبنی ہو گئے۔"

(ارواحِ ثلٰثہ، ص:۴۹)

حکایت واقعے کی عبارت چیخ رہی ہے کہ یہ صورتِ حال کسی ایک رمضان کے ساتھ خاص نہیں تھی بلکہ بالالتزام ہر رمضان المبارک میں اُنھیں ایک ماہ قبل ہی معلوم ہو جاتا تھا کہ چاند انتیس (۲۹) کا ہوگا یا تیس (۳۰) کا۔

اور مولوی محمود حسن صاحب دیوبندی کا یہ کہنا کہ "اہل بازار اور اہل پیشہ کے کاروبار اس پر مبنی ہو گئے۔" اس امر کو بالکل واضح کر دیتا ہے کہ ان کا کشف کبھی غلط نہیں ہوتا تھا اب آپ ہی انصاف سے کہیے! یہ آنکھوں سے لہو ٹپکنے کی بات ہے یا نہیں؟ کہ گھر کے بزرگوں کا تو یہ حال بیان

کیا جاتا ہے کہ ہر سال بالالتزام وہ ایک ماہ قبل ہی چھپی ہوئی بات معلوم کر لیتے تھے۔ لیکن رسولِ انور ﷺ کے متعلق ان کے عقیدے کی یہ صراحت گزر چکی کہ ایک ماہ کی طویل مدت میں بھی وہ معاذ اللہ چھپی ہوئی بات نہیں معلوم کر سکے۔

(۵)

غیبی قوت ادراک کی ایک اور حیرت انگیز کہانی:

انھی خان صاحب نے 'ارواحِ ثلٰثہ' میں شاہ عبدالقادر صاحب کا ایک اور واقعہ نقل کیا ہے۔ لکھا ہے کہ:

"اکبری مسجد جس میں شاہ عبدالقادر صاحب رہتے تھے اُس کے دونوں طرف بازار تھا، اور مسجد میں دونوں طرف حجرے اور سہ دریاں تھیں، ان میں ایک سہ دری میں شاہ عبدالقادر صاحب رہتے تھے اور اپنے حجرے سے باہر سہ دری میں پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھا کرتے تھے۔

بازار سے آنے جانے والے آپ کو سلام کیا کرتے تھے۔ سو اگر سُنّی سلام کرتا تو آپ سیدھے ہاتھ سے جواب دیتے تھے اور شیعہ سلام کرتا تو اُلٹے ہاتھ سے جواب دیتے تھے۔ یہ بیان کر کے مولوی عبدالقیوم صاحب نے فرمایا میں کیا؟ کہہ دوں "اَلْمُؤمِنُ یَنْظُرُ بِنُوْرِ اللہ" (یعنی مومن اللہ کے نور سے دیکھتا ہے)۔"

(ارواحِ ثلٰثہ، ص:۵۵)

"اَلْمُؤمِنُ یَنْظُرُ بِنُوْرِ اللہ" کا فقرہ بتا رہا ہے کہ شیعہ اور سُنّی کے درمیان یہ امتیاز کسی ظاہری علامت کی بنیاد پر نہیں تھا بلکہ اسی غیبی قوتِ ادراک کے ذریعے تھا جس کی تعبیر مولوی عبدالقیوم صاحب نے "نورِ الٰہی" سے کی ہے۔

حکایت واقعے کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اُن کے ہر روز کا معمول تھا اور جب تک سہ دری میں بیٹھے رہتے، کشف احوال کا یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ شاہ عبدالقادر صاحب کے حق میں تو کشف احوال کی ایک دائمی اور ہمہ وقتی قوت تسلیم کرلی گئی ہے، جو قوت بینائی کی طرح اُنھیں ہر وقت حاصل رہا کرتی تھی۔

لیکن شرم سے منہ چھپا لیجیے کہ نبی مرسل ﷺ کے حق میں کشفِ احوال کی یہی دائمی اور ہمہ وقتی قوت تسلیم کرتے ہوئے ان حضرات کا عقیدۂ توحید مجروح ہوجاتا ہے اور شرک کے غم میں یہ شب و روز سلگتے رہتے ہیں۔

(۶)

کشف ہی کشف:

ان ہی شاہ عبدالقادر صاحب کی غیب دانی سے متعلق تھانوی صاحب کی کتاب 'اشرف التنبیہ' کے حوالے سے ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے، لکھا ہے کہ:

"مولوی فضل حق صاحب شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث پڑھتے تھے۔ شاہ صاحب بڑے صاحبِ کشف تھے اور اس خاندان میں آپ کا کشف سب سے بڑھا ہوا تھا۔ جس روز مولوی فضلِ حق صاحب کسی ملازم پر کتابیں رکھوا کر لے جاتے گو پہنچنے سے پہلے خود لے لیتے، شاہ صاحب کو کشف سے معلوم ہوجاتا تھا، اس روز مولوی صاحب کو سبق نہیں پڑھاتے تھے اور جب خود لے جاتے تو حضرت کو کشف ہوجاتا اور اس روز سبق پڑھاتے تھے۔ جامع کہتا ہے:

ع: پیش اہل دل نگہدارید دل   تا نباشد از گمان بد خجل

(ارواحِ ثلٰثہ، ص: ۵۷)

اب ذرا اسی کے ساتھ اسی خاندان کے شاہ اسمٰعیل دہلوی کی یہ عبارت بھی پڑھ لیجیے عقیدہ و عمل کا تصادم واضح طور پر محسوس ہوجائے گا۔

"یہ سب جو غیب دانی کا دعویٰ کرتے ہیں، کوئی کشف کا دعویٰ رکھتا ہے کوئی استخارہ کے عمل سکھاتا ہے۔۔۔۔۔ یہ سب جھوٹے ہیں اور دغاباز۔"

(تقویۃ الایمان، ص: ۲۳)

علمائے دیوبند کے معتمد شاہ عبدالقادر صاحب بھی ہیں اور شاہ اسمٰعیل دہلوی بھی! اب اس امر کا فیصلہ انھی کے ذمے ہے کہ ان دونوں میں کون جھوٹا ہے اور کون سچا ہے؟

ہمیں تو یہاں صرف اتنا ہی کہنا ہے کہ بات ایک دن کی نہیں تھی بلکہ ہر روز اُنھیں کشف ہوتا تھا اور کتنی ہی دیواروں کے حجابات کے اوٹ سے وہ ہر روز دیکھ لیا کرتے تھے کہ کتاب کون لے کر آرہا ہے۔ اور کس نے کہاں سے اپنے ہاتھ میں لے لی ہیں۔ لیکن یہاں ہمیں اتنی بات کہنے کی اجازت دے دی جائے کہ اپنے نبی کے حق میں علمائے دیوبند کے دلوں کی کدورت یہیں سے صاف ظاہر ہوتی ہے کہ اپنے گھر کے بزرگوں کی نگاہوں پر تو دیواروں کا کوئی حجاب وہ حائل نہیں مانتے لیکن رسولِ انور ﷺ کے حق میں آج تک وہ اصرار کررہے ہیں کہ اُنھیں دیوار کے پیچھے کا بھی علم نہیں تھا، جیسا کہ گذشتہ اوراق میں اس کا حوالہ آپ کی نظر سے گزر چکا ہے۔

----------★★★----------

(۷)

حافظ محمد ضامن صاحب تھانوی کا قصہ

قبر میں دل لگی بازی کا ایک واقعہ:

یہی مولوی اشرف علی صاحب تھانوی اپنی جماعت کے ایک بزرگ حافظ ضامن صاحب کی قبر کے متعلق ایک نہایت دلچسپ قصہ بیان کرتے ہیں۔ لکھا ہے کہ:۔

"ایک صاحبِ کشف' حضرت حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر فاتحہ پڑھنے گئے۔ بعد فاتحہ کہنے لگے کہ بھائی یہ کون بزرگ ہیں؟ بڑے دل لگی باز ہیں۔ جب میں فاتحہ پڑھنے لگا تو مجھ سے فرمانے لگے کہ جاؤ کسی مُردہ پر پڑھیو۔ یہاں زندوں پر پڑھنے آئے ہو۔؟

(ارواحِ ثلٰثہ، ص: ۲۰۳)

ذرا اندازِ بیان کی یہ بے ساختگی ملاحظہ فرمایئے۔

عالمِ غیب کا پردہ اُٹھا کر جس سے چاہنا بات کر لینا اور جب چاہنا جھانک کر وہاں کا حال معلوم کر لینا کسی اور کے لیے مشکل ہو تو ہو لیکن ان حضرات کے لیے تو گویا شب و روز کا معمول ہے اور مُردوں کی تاریخ میں شاید پہلا دل لگی باز مُردہ ہے جس نے فاتحہ پڑھنے کو منع کر کے رحمت و ثواب سے اپنے استغناء کا اظہار کیا ہے۔

واقعے کا یہ رُخ بھی محسوس کرنے کے قابل ہے کہ اپنے مُردوں کی بڑائی ثابت کرنے کے لیے یہ لوگ کیسے کیسے زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں لیکن اہلِ اسلام کے بزرگوں کو عاجز و حقیر ثابت کرنے کے لیے ان کے قلم کی نوک کتنی زہر آلود ہو جاتی ہے۔

-----------★★★-----------

(۸)

سیّد احمد صاحب (رائے) بریلوی کا قصہ

جسمِ ظاہری کے ساتھ حضور انور کا تشریف لانا اور سیّد احمد رائے بریلوی کو نیند سے جگانا:

تبلیغی جماعت کے سربراہ مولوی ابوالحسن علی صاحب ندوی نے سید احمد صاحب رائے بریلوی کے متعلق اپنی کتاب "سیرت سید احمد شہید" میں اُن کا ایک عجیب قصہ نقل کیا ہے۔ لکھا ہے کہ:

"ستائیسویں شب کو آپ نے چاہا کہ ساری رات جاگوں اور عبادت کروں، مگر عشاء کی نماز کے بعد کچھ ایسا نیند کا غلبہ ہوا کہ آپ سو گئے۔ تہائی رات کے قریب دو شخصوں نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر جگایا۔ آپ نے دیکھا کہ آپ کی داہنی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور بائیں طرف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیٹھے ہیں اور آپ سے فرما رہے ہیں کہ احمد جلد اُٹھ اور غسل کر۔

سید صاحب ان دونوں حضرات کو دیکھ کر دوڑ کر مسجد کے حوض کی طرف گئے اور باوجود یہ کہ سردی سے حوض کا پانی یخ ہو رہا تھا۔ آپ نے اس سے غسل کیا اور فارغ ہو کر خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فرزند آج شب قدر ہے یادِ الٰہی میں مشغول ہو اور دعا و مناجات کرو۔ اس کے بعد دونوں حضرات تشریف لے گئے۔"

(سیرت سید احمد شہید، ص: ۸۴)

حد ہوگئی اکابر پرستی کی! کہ مولوی ابوالحسن علی ندوی جیسا ترقی پسند مصنّف، جس نے ساری زندگی قدامت پسند مسلمانوں کے عقائد و روایات کا مذاق اُڑایا ہے اسے بھی اپنے مورثِ اعلیٰ کی فضیلت و برتری ثابت کرنے کے لیے مشرکانہ عقیدوں کا سہارا لینا پڑا۔

صحت واقعہ کی تقدیر پر اُن سے کوئی بھی یہ سوال کر سکتا ہے کہ عالمِ بیداری میں حضور پرنور کی تشریف آوری کا عقیدہ، کیا غیب دانی اور اختیار و تصرف کی اس قوت کو ثابت نہیں کرتا جسے کسی مخلوق میں تسلیم کرنا، مولوی اسمٰعیل صاحب دہلوی نے شرک قرار دیا ہے۔

پس اگر حضور کو علمِ غیب نہیں تھا تو اُنھیں کیوں کر معلوم ہوا کہ سید احمد (رائے) بریلوی میرا فرزند ہے اور وہ فلاں مقام پر سو رہا ہے۔ پھر اگر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم میں تصرف کی قدرت نہیں تھی تو اپنے حریم اقدس سے زندوں کی طرح کیوں کر باہر تشریف لائے۔ اور اس پیکر میں ظہور فرمایا کہ دیکھنے والے نے ماتھے کی آنکھوں سے انھیں دیکھا اور پہچان لیا۔ اور یہ سارا واقعہ چشم زدن میں نہیں ختم ہو گیا کہ اسے واہمہ کا تصرف قرار دیا جا سکے بلکہ اتنی دیر تک تشریف فرما رہے کہ سید صاحب غسل سے فارغ ہو گئے۔

یہ سارے اختیارات و تصرفات وہ ہیں کہ بہ عطائے الٰہی بھی حضور کی جانب ان کی نسبت کی جائے جب بھی دیوبندی مذہب میں شرک صریح ہے۔ لیکن یہ سارا شرک صرف اس جذبے میں گوارا کر لیا گیا کہ قبیلے کے "شیخ" کی بڑائی کسی طرح ثابت ہو جائے۔ بہ نفسِ نفیس خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جس کا ہاتھ پکڑ کر نیند سے اُٹھائیں اندازہ لگا لیجیے کہ اس کے منصب کی برتری کا کیا عالم ہوگا۔؟

(۹)

ایک نہایت لرزہ خیز کہانی:

مولوی اسمٰعیل دہلوی نے انہی سید احمد (رائے) بریلوی کی عظمت و برتری ثابت کرنے کے لیے اپنی کتاب ''صراطِ مستقیم'' میں ایک نہایت لرزہ خیز قصہ بیان کیا ہے۔ جس کا اُردو میں ترجمہ یہ ہے:

''حضرت غوث الثقلین اور حضرت خواجہ بہاءُ الدین نقشبند کی روحوں کے درمیان ایک مہینے تک اس بات پر جھگڑا چلتا رہا کہ دونوں میں کون سید احمد (رائے) بریلوی کو روحانی تربیت کے لیے اپنی کفالت میں لے دونوں بزرگوں کی روحوں میں سے ہر ایک روح کا اصرار تھا کہ وہ تنہا میری نگرانی میں عرفان و سلوک کی منزل طے کریں۔

بالآخر ایک مہینے کی آویزش کے بعد اس بات پر دونوں میں مصالحت ہوئی کہ مشترک طور پر دونوں یہ خدمت انجام دیں گے۔ چنانچہ ایک دن دونوں حضرات کی روحیں ان پر جلوہ گر ہوئیں اور پوری قوت کے ساتھ تھوڑی دیر تک ان پر عرفان و توجہ کا عکس ڈالا۔ یہاں تک کہ اتنے ہی وقفے میں اُنھیں دونوں سلسلوں کی نسبتیں حاصل ہوگئیں۔''

(صراطِ مستقیم، ص:۱۶۶)

دیوبندی مذہب کے پیش نظر اس قصے کی صحت تسلیم کر لینے کی صورت میں کئی سوالات ذہن کی سطح پر اُبھرتے ہیں۔

اوّلاً یہ کہ مولوی اسمٰعیل دہلوی کی تصریح کے مطابق جب بہ عطائے الٰہی بھی کسی میں غیب دانی کی قوت نہیں ہے تو حضرت غوث الثقلین اور حضرت خواجہ نقشبند کی ارواحِ طیبات کو کیوں کر خبر ہوگئی کہ ہندوستان میں سید احمد (رائے) بریلوی نامی ایک شخص خدا کا مقرب بندہ جس کی روحانی

تربیت کا اعزاز اس قابل ہے کہ اس طرف سبقت کی جائے۔

ثانیاً یہ کہ واقعہ ھذا عالمِ شہادت کا نہیں بلکہ سرتاسر عالمِ غیب کا[1] ہے۔ اس لیے مولوی اسمٰعیل دہلوی جو اس واقعے کے خود راوی ہیں اُنھیں کیوں کر علم ہوا کہ سید احمد (رائے) بریلوی کی کفالت و تربیت کے لیے ان دونوں بزرگوں کی روحیں ایک مہینے تک آپس میں جھگڑتی رہیں اور بالآخر اس بات پر مصالحت ہوئی کہ دونوں مشترک طور پر اپنی کفالت پر رہیں۔

ثالثاً یہ کہ مولوی اسمٰعیل دہلوی کی 'تقویۃ الایمان' کے مطابق جب خدا کے سوا سارے انبیا و اولیا بھی عاجز و بے اختیار بندے ہیں تو وفات کے بعد حضرت غوث الوریٰ اور خواجہ نقشبند کا یہ عظیم تصرف کیوں کر سمجھ میں آسکتا ہے کہ وہ دونوں بزرگ بغداد سے سیدھے ہندوستان کے اس قصبے میں تشریف لائے جہاں سید احمد صاحب (رائے) بریلوی مقیم تھے اور اُن کے حُجرے میں چشم زدن میں اُنھیں باطنی عرفانی دولت سے مالا مال کر دیا۔

نیز واقعے کے اندازِ بیان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ باتیں خواب کی نہیں بلکہ عالمِ بیداری کی ہیں۔ اس لیے اب اس واقعے کی تصدیق اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک تقویۃ الایمان کے موقف سے ہٹ کر اولیائے کرام کے حق میں غیبی ادراک اور قدرت و اختیار کے عقیدے کی صحت نہ تسلیم کر لی جائے۔

دیوبندی علما کی مذہبی فریب کاریوں کا یہ تماشا اب پسِ پردہ نہیں ہے کہ انکار کی گنجائش ہو۔ اب تو ان کا یہ ایمان سوز کردار وقت کا اشتہار بن چکا ہے کہ ایک جگہ وہ انبیا و اولیا کے قرار واقعی فضائل و کمالات کا یہ کہہ کر انکار کر دیتے ہیں کہ انھیں تسلیم کر لینے سے عقیدۂ توحید کی سلامتی پر ضرب پڑتی ہے اور دوسری جگہ اس ضرب کو گھر کے بزرگوں کی برتری ثابت کرنے کے لیے پوری بشاشتِ قلب کے ساتھ گوارا کر لیتے ہیں۔

----------★★★----------

(۱۰)

مولوی اسمٰعیل دہلوی کا قصّہ

غیب دانی اور شفا بخشی کا دعویٰ:

مولوی اسمٰعیل دہلوی مُصنّف ''تقویۃ الایمان'' کے کشف اور باطنی تصرفات سے متعلق 'ارواحِ ثلٰثہ' میں امیر شاہ خاں نے ایک نہایت دلچسپ قصّہ نقل کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

''میرے استاد میاں جی محمدی صاحب کے صاحب زادے حافظ عبدالعزیز ۔۔۔ایک مرتبہ اپنے بچپن میں نہایت سخت بیمار ہوئے اور اطباء نے جواب دے دیا۔ ان کے والدین کو اس وجہ سے تشویش تھی۔ اتفاق سے میاں جی صاحب نے خواب میں دیکھا کہ مولوی اسمٰعیل صاحب مسجد کے بیچ کے در میں واعظ فرما رہے ہیں، اور میں مسجد کے اندر ہوں اور میرے پاس عبدالعزیز بیٹھا ہے۔ اتفاق سے اُسے پیشاب کی ضرورت ہوئی اور میں اُسے پیشاب کرانے چلا۔ آدمیوں کی کثرت کی وجہ سے اور طرف کو راستہ نہ تھا اور مولوی اسمٰعیل صاحب سے بے تکلفی تھی اس لیے میں اسے مولوی اسمٰعیل صاحب کی طرف لے کر گیا۔ جب عبدالعزیز مولوی اسمٰعیل صاحب کے سامنے پہنچا تو اُنھوں نے تین مرتبہ یا شافی پڑھ کر اس پر دم کر دیا۔ اس خواب کے بعد جب آنکھ کھلی تو انھوں نے اپنی بیوی کو جگایا اور کہا کہ عبدالعزیز اچھا ہو گیا۔ میں نے اس وقت ایسا ایسا خواب دیکھا ہے۔ صبح ہوئی تو میاں عبدالعزیز بالکل تندرست تھے۔''

(ارواحِ ثلٰثہ، ص:۸۸)

اب اسے نیرنگیِ وقت ہی کہیے کہ جو شخص ساری زندگی انبیا کے علم غیب کے خلاف جنگ کرتا رہا اُسی کو مرنے کے بعد غیب داں بنا دیا گیا۔ کیوں کہ ان حضرات کے تئیں اُنھیں اگر علم غیب نہیں تھا تو

اُنھیں خواب میں کیوں کر معلوم ہوا کہ عبدالعزیز بیمار ہے اُسے دم کیا جائے۔

اور خواب دیکھنے والے کا جذبۂ عقیدت بھی کتنا بالیقین ہے کہ آنکھ کھلتے ہی بی بی کو جگا کر یہ خوش خبری بھی سنا دی کہ بیٹا اچھا ہو گیا۔ اور سچ مچ صبح تک بیٹا اچھا بھی ہو گیا۔

اسے کہتے ہیں غیب دانی اور شفا بخشی کا عقیدہ جو ان حضرات کے یہاں انبیا و اولیا کے حق میں تو شرک ہے لیکن مولوی اسمٰعیل دہلوی کے حق میں عین اسلام بن گیا ہے۔

------------★★★------------

(۱۱)

مولوی محمودُالحسن صاحب کا قصّہ

مذہب سے انحراف کی ایک شرم ناک کہانی:

دیوبندی جماعت کے شیخ الحدیث مولوی اصغر حسین صاحب نے اپنی کتاب 'حیات شیخ الہند' میں مولوی محمودالحسن صاحب کے متعلق ایک نہایت عجیب و غریب واقعہ نقل کیا ہے۔ لکھا ہے کہ:

''۱۳۲۲ھ کے اخیر میں دیوبند میں شدید طاعون ہوا، چند طلبہ بھی مبتلا ہوئے۔ ایک فارغ التحصیل طالب علم محمد صالح ولایتی جو صبح و شام میں سندِ فراغت لے کر وطن رخصت ہونے والے تھے اس مرض میں مبتلا ہوئے اور حالت آخری ہو گئی۔ وفات سے کسی قدر پہلے اُنھوں نے ایسی گفتگو شروع کی کہ گویا شیطان سے مناظرہ کر رہے ہیں۔ اس کے دلائل کو توڑتے اور اپنے استدلال پیش کرتے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے مناظرہ میں شیطان کو بخوبی شکست دے دی۔ پھر کہنے لگے افسوس اس جگہ کوئی ایسا خدا کا بندہ نہیں ہے جو مجھ سے اس خبیث کو دفع کرے۔ یہ کہتے کہتے دفعۃً بول اُٹھے کہ واہ! واہ! سبحان اللہ! دیکھو میرے اُستاد حضرت مولانا محمودالحسن صاحب تشریف لائے دیکھو وہ شیطان بھاگا۔ ارے

خبیث کہاں جاتا ہے؟ ایک ساعت کے بعد طالب علم کا انتقال ہوگیا۔ حضرت مولانا اس واقعہ کے وقت وہاں موجود نہ تھے۔ مگر روحانی تصرف سے امداد فرمائی۔

(حیات شیخ الہند، ص:۱۹۷)

اخیر میں یہ اضافہ کرکے کہ ”حضرت مولانا اس واقعے کے وقت وہاں موجود نہ تھے۔ مگر روحانی تصرف سے امداد فرمائی“ بالکل واضح کردیا ہے کہ اُس طالب علم کو جو واقعہ پیش آیا وہ اس کے واہمہ کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ فی الواقع مولوی محمود الحسن صاحب اس کی امداد کے لیے غیبی طور پر وہاں پہنچ گئے تھے۔

مگر حیرت ہے کہ دیوبندی عقل فتنہ پرداز یہاں کوئی سوال نہیں اُٹھاتی کہ جب وہ وہاں موجود نہیں تھے تو اُنھیں کیوں کر خبر ہوگئی کہ ایک طالب عالم سکرات میں شیطان سے مناظرہ کررہا ہے۔ اور خبر بھی ہوئی تو بجلی کی طرح اُنھیں قوتِ پرواز کہاں سے مل گئی کہ چشم زدن میں وہاں آموجود ہوئے۔

دراصل کلیجہ پھٹنے کی بات یہی ہے کہ یہاں غیب دانی بھی ہے اور قدرت و اختیار بھی! لیکن چونکہ ”اپنے مولانا“ کی بات ہے اس لیے نہ یہاں عقیدۂ توحید مجروح ہوا اور نہ کتاب و سنت سے کوئی تصادم لازم آیا۔

لیکن اسی طرح کا عقیدہ اگر ہم سرکار غوث الوریٰ یا خواجہ غریب نواز، کسی نبی یا ولی کے حق میں روا رکھ لیں تو دیوبند کے یہ موحدین ہماری جان و ایمان کے درپے ہوجاتے ہیں۔

----------★★★----------

جناب مولوی عبدالرشید صاحب رانی ساگری کے واقعات

جناب مولوی عبدالرشید صاحب رانی ساگری دیوبندی جماعت کے ایک علاقائی پیر ہیں۔ امارت شرعیہ پھلواری شریف جس کے امیر مولوی شاہ منت اللہ صاحب رحمانی رکنِ مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند ہیں اس کے ترجمان اخبار نقیب نے ”مصلح اُمت نمبر“ کے نام سے مولوی عبدالرشید صاحب رانی ساگری کے حالات میں ایک ضخیم نمبر شائع کیا ہے ذیل کے جملہ واقعات اسی نمبر سے ماخوذ ہیں۔

(۱۲)

اپنے مذہبی معتقدات کا دردناک قتل:

مولوی شمس تبریز خاں صاحب قاسمی کے حوالے سے مولوی عبدالرشید صاحب رانی ساگری کی عام غیب دانی کے متعلق یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ:

”مجلس میں اکثر ایسا ہوتا کہ کوئی شخص مولانا سے کچھ سوالات کرنے والا ہوتا مگر آپ سوال سے پہلے ہی جواب دے دیتے تھے۔ ایک بار ایک نوجوان سے صبح کے وقت ملے اور بلا کچھ معلوم کیے ہوئے سلسلۂ گفتگو میں انھیں نصیحت کی کہ نماز صبح ہرگز قضا نہ ہونی چاہیے، وہ سمجھ گئے کہ آج نماز قضا ہوئی ہے یہ اشارہ کشفی اسی کی طرف ہے۔

اسی طرح کلٹی (بردوان) مجلس میں بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ عورتیں آئیں گی پردہ کرائیے۔ چنانچہ دوسرے ہی لمحہ عورتوں کی دستک سنائی دی۔“

(نقیب پھلواری کا مصلح امت نمبر، ص:۵)

دل کے خطرات پر مطلع ہونے کا معمول تو تھا ہی، گذشتہ اور آئندہ کا علم بھی انہیں حاصل تھا۔ جبھی تو ایک طرف فوت شدہ نمازِ صبح کی خبر دی تو دوسری طرف آنے والی عورتوں کا بھی حال بتا دیا۔

(۱۳)

غیب دانی سے متعلق نیاز مندوں کی خوش عقیدگی کا

ایک عبرت انگیز واقعہ:

اب انہی رانی ساگری صاحب کی غیب دانی سے متعلق نیاز مندوں کی خوش عقیدگی کا ایک اور قصہ ملاحظہ فرمائیے۔

مدرسہ رشید العلوم چترا ضلع ہزاری باغ کے صدر مدرس مولوی وصی الدین صاحب بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں نماز جمعہ کے بعد حضرت کے حجرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ وہ اپنی چارپائی پر بہت مغموم بیٹھے ہیں۔ بیان کرتے ہیں کہ حضرت آج میں آپ کو بہت مغموم پا رہا ہوں کیا کوئی بات ہوئی ہے۔ اب اس کے بعد کا واقعہ خود واقعہ نگار کی زبانی سُنیے۔ لکھتے ہیں کہ:

''حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا کہ پاکستان میں دو بہت بڑے حادثے ہو گئے ہیں۔ علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہو گیا ہے اور ایک ہوائی جہاز گر کر تباہ ہو گیا ہے۔ جس میں پاکستان کے کئی ذمہ دار حضرات انتقال فرما گئے۔

مولانا وصی الدین احمد صاحب کہتے ہیں کہ مجھے اس پر حیرت واستعجاب ہوا کہ آپ کو اخباری دنیا سے بے تعلقی ہے آخر اطلاع کیسے ہوئی اُن سے رہا نہ گیا۔ بالآخر پوچھ ہی لیا کہ حضور آپ کو کس طرح اطلاع پہنچی؟

اس پر آپ نے فرمایا کہ یہاں اخبار میں خبر ہے دیکھو تو اخبار آیا ہوگا۔ میں نے اس پر کہا کہ اخبار تو ابھی آیا بھی نہیں ہے اور حضرت! ابھی تو ڈاک کا وقت بھی نہیں ہوا ہے۔ بہرحال مولانا وصی الدین باہر نکلتے ہیں کہ ڈاکیہ آ رہا ہے۔

اس واقعہ میں حضرت کے دو انکشاف ظاہر ہوئے۔ پہلا کشف علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا وصال اور ہوائی جہاز کا حادثہ اور دوسرا تازہ کشف ڈاکیہ کے اخبار لے کر آنے کا۔ چنانچہ جب دیکھا گیا کہ یہ دونوں حادثات جلی سُرخیوں میں چھپے ہوئے تھے اس سے پہلے کسی اخبار میں نہ تذکرہ آیا تھا اور نہ اس وقت ریڈیو کا عام رواج چترا میں تھا جس کے ذریعہ خبر ملتی۔''

(نقیب پھلواری کا مصلح امت نمبر، ص:۱۸)

اس واقعہ میں زاویہ نگاہ کی ایک خاص چیز ملاحظہ فرمائیے:

واقعہ نگار نے جگہ جگہ اس طرح کے فقرے بڑھا کر '' آپ کو اخباری دنیا سے بے تعلقی ہے آخر اطلاع کیسے ہوئی؟'' ''اخبار تو ابھی آیا بھی نہیں ہے۔'' ''حضرت! ابھی تو ڈاک کا وقت بھی

نہیں ہوا۔'' ''اس سے پہلے کسی اخبار میں یہ تذکرہ آیا تھا اور نہ اُس وقت ریڈیو کا عام رواج چترا میں تھا۔'' سارا زورِ قلم اس بات پر صرف کیا ہے کہ کسی طرح ثابت ہو جائے کہ آپؒ کو علمِ غیب تھا۔ لیکن یہی دیوبندی علما جب رسول اللہ ﷺ کے علم غیب سے متعلق کسی واقعے پر بحث کرتے ہیں تو ایک ایک سطر اس کوشش کی آئینہ دار ہوتی ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو یہ ثابت کیا جائے کہ حضور ﷺ کو علمِ غیب نہیں تھا۔ حضرت جبریل امین خبر دیتے تھے۔

زاویہ نگاہ کا یہ فرق جس جذبے پر مبنی ہے اسے نہ بھی ظاہر کیا جائے جب بھی اپنی جگہ وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔

(۱۴)

اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ:

انہی رانی ساگر صاحب کا ایک دلچسپ لطیفہ اور سُنیے۔ موصوف کے ایک اور مرید مولوی شہاب الدین رشیدی نقیب کے اسی 'مصلح اُمت نمبر' میں ایک عجیب وغریب واقعہ کے راوی ہیں۔ بیان کرتے ہیں کہ:

''مجھ سے میرے محترم دوست اور حضرت کے خویش مولانا الحاج اشرف علی صاحب نے بیان کیا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ ایک امیر زادہ نوجوان شخص تھا۔ ان کی زندگی بہت ہی لاابالی پن میں گزری۔ ان کا جب انتقال ہو گیا تو میں ایک دن قبرستان گیا تو اس شخص کو دیکھا کہ قبر میں ننگا بیٹھا ہے اور بہت ہی حسرت و یاس کے عالم میں ہے۔ میں جب قریب پہنچا تو اس نے ہمیں دیکھ کر اپنی ستر دونوں ہاتھوں سے چھپالی میں نے اس سے کہا کہ اسی لیے نہ میں تجھے کہتا تھا لیکن تو نے اپنی زندگی لاپرواہی میں گزار دی اور میری باتوں کی طرف دھیان نہیں دیا۔''

(نقیب پھلواری کا مصلح اُمت نمبر، ص:۱۹)

اس واقعے کو پڑھنے کے بعد بالکل ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اُنھیں کسی مردہ کے ساتھ نہیں بلکہ زندہ کے ساتھ پیش آیا تھا اور عالمِ برزخ کا نہیں بلکہ عالم دنیا کا ہے اور واقعہ عالمِ برزخ ہی کا ہے تو ماننا پڑے گا کہ عالمِ غیب کے ساتھ ان حضرات کا تعلق بالکل گھر اور آنگن کا ہے۔ عالمِ غیب کا کوئی پردہ ان کی نگاہوں پر حائل نہیں ہے۔ جدھر نگاہ اُٹھی غیب کی چیزیں خود بخود بے نقاب ہوگئیں۔ انصاف کیجیے! ایک طرف تو اپنے بزرگوں کی قوت انکشاف کا یہ حال بیان کیا جاتا ہے اور دوسری طرف سید الانبیا ﷺ کے حق میں آج تک اصرار کر رہے ہیں کہ اُنھیں دیوار کے پیچھے کا بھی علم نہیں ہے۔

(۱۵)

کاروبارِ عالم میں تصرف کا واقعہ:

کاروبارِ عالم میں ان حضرات کے اقتدار اور خود مختار تصرف کا تماشا دیکھنا چاہتے ہوں تو اس کتاب کا یہ آخری قصہ پڑھیے انھی رانی ساگری صاحب کی صاحب زادی ثامنہ خاتون کی یادداشت سے نقیب کے اسی 'مصلح امت نمبر' میں یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے۔ موصوفہ بیان کرتی ہیں کہ:

جب ہمارا گھر بننے لگا تو والد صاحب قبلہ کی ہدایت کے مطابق سب سے پہلے پاخانہ میں ہاتھ لگا۔ وہ زمانہ برسات کا تھا۔ لیکن بارش نہیں ہو رہی تھی۔ دھان کی روپنی ہو چکی تھی۔ کسان سخت پریشان تھے۔ میں نے والد صاحب سے درخواست کی کہ بارش کے لیے دعا فرما دیجیے۔ بہت لوگ پریشان ہیں، فصل کو خطرہ ہے۔ والد صاحب مسکرانے لگے اور پھر فرمایا، بارش کیسے ہوگی؟ اپنا پاخانہ جو بن رہا ہے خراب ہو جائے گا۔

میں نے پوچھا کب تک پائخانہ بن جائے گا؟ بولے دیوار مکمل ہوگئی ہے رات کو چھت کی ڈھلائی ہو جائے گی، میں خاموش ہوگئی۔ دو دن بعد خوب زوردار بارش شروع ہوگئی۔ والد صاحب گھر ہی پر تھے میں نے پوچھا۔ بارش ہونے لگی

اب تو پائخانہ میں نقصان نہ ہوگا؟ فرمانے لگے نہیں بیٹا! اب تو فائدہ ہوگا۔ میں نے پوچھا تو کیا پائخانے ہی کے لیے بارش رُکی ہوئی تھی؟ والد صاحبؒ نے کوئی جواب نہیں دیا صرف مسکراتے رہے۔ اس وقت والد صاحب تندرست تھے۔"

(نقیب کا مصلح اُمت نمبر، ص:۴)

اس واقعے کے بیان سے جس عقیدے کا اظہار مقصود ہے وہ یا تو یہ ہے اُنھیں اس بات کا علم تھا کہ بارش ابھی نہیں ہوگی اور وہ بھی جانتے تھے کہ بارش کیوں رُکی ہوئی ہے؟

یا پھر یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ کاروبارِ ہستی میں ان کی ذاتی خواہش اتنی دخیل اور موثر تھی کہ اگرچہ زمین کا سینہ تپتا رہا، فصل جلتی رہی اور کاشتکاروں کی آہیں بابِ رحمت پر سر پٹکتی رہیں لیکن جب تک اُن کا پاخانہ تیار نہیں ہوگیا بارش کو چار و ناچار رُکنا پڑا "بارش کیسے ہوگی" کا فقرہ بھی واضح طور پر اس رُخ کو متعین کرتا ہے کہ اُنھوں نے جب تک نہیں چاہا بارش نہیں ہوئی۔

اب آپ کی غیرتِ ایمانی اخلاص و وفا کی منزل سے بخیر و عافیت گزر سکتی ہو تو آپ ہی فیصلہ کیجیے کہ کاروبارِ عالم میں گھر کے بزرگوں کے اثر و رسوخ کا تو یہ حال بیان کیا جاتا ہے لیکن خدا کے پیغمبرِ اعظم ﷺ کی جناب میں ان حضرات کے عقیدے کی زبان یہ ہے:

"سارا کاروبار جہان کا اللہ ہی کے چاہنے سے ہوتا ہے۔ رسول کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔

(تقویۃ الایمان، ص:۵۸)

عقیدے کا طغیان تو اپنی جگہ پر ہے الفاظ و بیان کی جارحیت ذرا ملاحظہ فرمائیے کہ "سارا کاروبار جہان کا اللہ ہی کے چاہنے سے ہوتا ہے۔" اتنا فقرہ بھی عقیدۂ توحید کا مفاد پورا کرنے کے لیے کافی تھا۔ لیکن "رسول کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔" اس فقرے کا اضافہ صرف اس جذبۂ تحقیر کے اظہار کے لیے ہے جو ان حضرات کے دلوں میں رسولِ خدا کی طرف سے جاگزین ہو چکا ہے۔

ع: "نہ تھی دل میں تو کیوں آئی زباں پر"

----------★★★----------

دیوبندی جماعت کے تین نئے بزرگوں کے واقعات کا اضافہ

قاری فخرالحسن صاحب گیاوی جو مولانا حسین احمد صاحب شیخ دیوبند کے مُرید اور خلیفہ مجاز ہیں اور صوبۂ بہار میں دیوبندی مذہب کے بہت بڑے مبلّغ و پیشوا سمجھے جاتے ہیں، انھوں نے ''درسِ حیات'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو مدنی کتب خانہ قاسمیہ گیا سے شائع ہوئی ہے۔

اس کتاب میں موصوف نے اپنی جماعت کے تین ''بزرگوں'' کے حالاتِ زندگی قلم بند کیے ہیں۔ ان میں سے ایک تو اُن کے نانا مولوی عبدالغفار سرحدی ہیں۔ دوسرے اُن کے والد مولوی خیرالدین شاگرد مولوی محمود الحسن صاحب دیوبندی ہیں، تیسرے اُن کے اُستاد اور والد کے دوست مولوی بشارت کریم صاحب ہیں۔ یہ تینوں حضرات اپنے زمانے میں دیوبندی مذہب کے علاقائی رہنما اور سرگرم مُبلّغ تھے۔

اب آنے والے صفحات میں ترتیب وار تینوں کے وہ واقعات پڑھیے۔ جنھیں صحیح مان لینے کی صورت میں دیوبندی مکتبِ فکر کی بنیاد متزلزل ہوجاتی ہے اور ایک انصاف پسند آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ یہ کتاب شاید اسی لیے لکھی گئی ہے کہ دیوبندی مذہب کا جھوٹ فاش کیا جائے۔

مولوی عبدالغفّار صاحب سرحدی کے واقعات

(۱۵)

(۱) ایک غیب داں جن کا قصّہ

درسِ حیات کے مصنّف نے اپنے نانا مولوی عبدالغفار صاحب کے متعلق یہ دعویٰ کیا ہے کہ انسانوں کے علاوہ جنّات بھی اُن سے تعلیم حاصل کرتے تھے اور بہت سے جنّات ان کے حلقہ بگوشوں میں بھی شامل تھے۔

چنانچہ ایک جن طالب علم کا قصّہ بیان کرتے ہوئے اُنھوں نے لکھا ہے کہ اُس کے

ساتھیوں میں سے ایک لڑکے کو اس کے متعلق کسی طرح سے معلوم ہوگیا کہ وہ جن ہے۔ دوستانہ تعلقات تو پہلے ہی سے تھے یہ معلوم ہونے کے بعد اب وہ اس کے پیچھے پڑ گیا اور کہنے لگا کہ میں ایک غریب آدمی ہوں تم میری مالی امداد کرکے دیرینہ دوستی کا حق ادا کرو۔ یہ کام تمہارے لیے کچھ مشکل نہیں ہے۔ اس نے معذرت چاہتے ہوئے جواب دیا کہ ایسا صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ میں تمہارے لیے چوری کروں اور مولوی ہوکر میں کبھی یہ کام نہیں کروں گا۔

لکھا ہے کہ اُس جن کا وہ آخری سال تھا۔ بخاری شریف ختم کرکے جب وہ گھر جانے لگا تو اُس کے ساتھی نے اس سے تنہائی میں ملاقات کی اور آب دیدہ ہوکر کہا۔ اب تو تم جا ہی رہے ہو۔ لیکن وقتِ رخصت کم از کم اتنا تو بتادو کہ تم سے اب ملاقات کی صورت کیا ہوگی۔ جواب دیا میں تمھیں چند مخصوص کلمات بتا دیتا ہوں جب بھی ملاقات کو جی چاہے پڑھ لیا کرنا میں حاضر ہوجایا کروں گا۔ چنانچہ اس کے چلے جانے کے بعد جب بھی ملاقات کی خواہش ہوتی وہ مذکورہ کلمات پڑھ لیا کرتے اور وہ حاضر ہوجایا کرتا۔

اب اس کے بعد کا واقعہ خود مصنّف کی زبانی سُنیے۔ لکھا ہے کہ:

> ''ایک مرتبہ وہ بہت مالی پریشانی میں مبتلا ہوگئے۔ لڑکی کی شادی کرنی تھی اور پیسے پاس میں نہ تھے اس موقع پر وہ جن دوست یاد آگئے اُن چند کلمات کا ورد کرنا تھا کہ جن صاحب تشریف لے آئے۔ اُنھوں نے اپنی پریشانی کا ذکر اُن سے کیا۔
>
> اُنھوں نے کہا اچھا میں آپ کے لیے چوری تو کروں گا نہیں یہ حرام طریقہ میں اختیار نہیں کرسکتا ہوں مگر جائز ذرائع سے کچھ رقم آپ کے لیے مہیا کرکے آپ کی ضرور مدد کروں گا۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ دوسرے دن وہ جن صاحب آکر اُن پریشان حال دوست کو معقول رقم دے گئے مگر تاکید کر گئے کہ اُس کا ذکر کسی سے نہ کریں۔''
>
> (درسِ حیات، ج:۱، ص:۶۲)

اس رقم سے اُنھوں نے نہایت تزک واحتشام اور دھوم دھام سے اپنی بچی کی شادی کی۔ امیرانہ ٹھاٹھ باٹ دیکھ کر لوگوں کو سخت حیرت ہوئی اور لوگ سوچنے لگے کہ اچانک اتنی کثیر رقم اُنھیں کہاں

سے مل گئی۔ دوسروں کو تو پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ لیکن بیوی ان کے سر ہوگئی ہزار ٹالنا چاہا لیکن بیوی کا اصرار بڑھتا گیا یہاں تک کہ مجبور ہو کر اُنھیں سارا بھید ظاہر کرنا پڑا۔ اب اس کے بعد کا واقعہ فرطِ حیرت کے ساتھ سُنیے۔ لکھا ہے کہ:

"اس کا اثر یہ ہوا کہ اب اُنھوں نے جب بھی وہ کلمات اس اُمید پر پڑھے کہ وہ جن صاحب تشریف لائیں گے اور اُن سے ملاقات کریں گے لیکن کبھی اُن کی یہ اُمید پوری نہ ہو سکی اور اُن سے جن نے ملاقات کا سلسلہ ختم کر دیا۔"

(درسِ حیات، ص:۶۳)

اب ایک طرف یہ واقعہ نظر میں رکھیے اور دوسری طرف دیوبندی مذہب کی بنیادی کتاب 'تقویۃ الایمان' کا فرمان پڑھیے۔

"اللہ صاحب نے پیغمبر صلعم کو فرمایا کہ لوگوں سے یوں کہہ دیویں کہ غیب کی بات سوا اللہ کے کوئی نہیں جانتا نہ فرشتہ نہ آدمی نہ جن۔"

(تقویۃ الایمان، ص:۲۲)

یہ مذہب ہے اور وہ واقعہ! اور دونوں ایک دوسرے کو جھٹلا رہے ہیں۔

اب آپ ہی منصفی سے کہیے کہ وہ جن اگر غیب داں نہیں تھا تو گھر کے اندر بیوی کے ساتھ کی جانے والی گفتگو کی اطلاع اُسے کیوں کر ہوگئی؟ اور اگر نہیں ہوئی تو اس نے ملاقات کا سلسلہ کیوں ختم کر دیا۔ اور توہین علم و دیانت کی نہ مٹنے والی سُرخی تو یہ ہے کہ اطلاع و آگہی کا یہ واقعہ کچھ ایک بار کا نہیں تھا کہ اُسے حسنِ اتفاق کا نتیجہ کہہ کر گزر جایئے، بلکہ واقعہ کی صراحت کے مطابق سیکڑوں میل کی مسافت سے اُن کلمات کا ورد کرتے ہی اُسے ہمیشہ خبر ہو جایا کرتی تھی کہ فلاں مقام پر فلاں شخص مجھے یاد کر رہا ہے۔

اب اس کا مطلب سوا اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ اُسے ہمہ وقتی غیب دانی کا منصب حاصل تھا۔ بالکل وائرلیس کی طرح اِدھر سگنل دیا اور اُدھر وصول کر لیا۔

قتال و جدال کے معرکوں میں دو لشکروں کا تصادم تو اکثر پیش آیا ہے لیکن اپنے ہی مذہب

کے ساتھ ایسا خوں ریز تصادم شاید ہی تاریخ میں پیش آیا ہو۔

فیا للعجب! کہ اسی دین و دیانت پر علمائے دیوبند کو غرہ ہے کہ وہ رُوئے زمین پر عقیدۂ توحید کے سب سے بڑے علمبردار ہیں۔

(۲) جماعتی مسلک کا ایک اور خون:

اپنی اسی کتاب میں مصنف نے آگے چل کر اپنے نانا کے حق میں خدائی منصب کا ایک صاف و صریح دعویٰ کیا ہے۔ قوسین کے تشریحی اضافے کے ساتھ دعوے کی یہ سُرخی ملاحظہ فرمایئے!

علوم تکوینیات (انتظام عالم) سے مولانا کا تعلق!:

اب دریائے حیرت میں ڈوب کر دعوے کے یہ الفاظ پڑھیے:

"علوم تکوینیہ انتظامیہ سے بھی مولانا کا تعلق تھا اور علم تکوینیات کے کارکنوں کا مولانا سے ملنا اور مشورہ کرنا اور ان سے گہرے روابط اور تعلقات بھی وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتے رہتے تھے۔"

(درسِ حیات، ص:۸۵)

کیا سمجھے آپ؟ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ نانا میاں اس محکمے کے "آفیسر انچارج" تھے اور ماتحت کارندے آپ کے مشورے کے مطابق عالم کے انتظامات کا کام سنبھالتے تھے اور یہ کچھ میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ خود مصنّف نے اپنی کتاب میں اس کا دعویٰ کیا ہے ارشاد فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ کی طرف سے عالم کے تمام انتظامات کے لیے کارندے مقرر ہیں وہی سب کچھ کرتے ہیں۔ وہ اس علم کی اصطلاح میں "اصحاب خدمت" کہلاتے ہیں۔"

(درسِ حیات، ص۸۹)

یہ سوال جو عام طور پر کیا جاتا ہے کہ کیا خدا تمہاری مدد نہیں کر سکتا جو تم انبیا و اولیا کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو، اگر صحیح ہے تو ہمیں بھی یہ سوال کرنے کی اجازت دی جائے کہ "وہی سب کچھ کرتے

ہیں'' تو پھر خدا کیا کرتا ہے؟ کیا وہ اکیلا عالم کا انتظام نہیں کرسکتا جو اس نے انسانوں میں سے جگہ جگہ اپنے کارندے مقرر فرمائے ہیں۔

ضمناً یہ بات نکل آئی۔ ورنہ کہنا یہ ہے کہ ایک طرف ''نانا میاں'' کا یہ تکوینی اور انتظامی اختیار ملاحظہ فرمائیے اور دوسری طرف تقویۃ الایمان کا یہ فرمان پڑھیے۔ توحید پرستی اور خدا پرستی کا سارا بھرم کھل جائے گا:

''اللہ صاحب کو دنیا کے بادشاہوں کی طرح نہ سمجھے کہ بڑے بڑے کام تو آپ کرتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے کام اور نوکروں چاکروں کو حوالہ کر دیتے ہیں۔ سو لوگوں کو چھوٹے چھوٹے کاموں میں ان کی التجا کرنی ضرور پڑتی ہے۔ سو اللہ کے یہاں کا کارخانہ یوں نہیں ہے۔''

(تقویۃ الایمان، ص:۳۶)

یہ ہے عقیدہ وہ ہے عمل! اور دونوں کے درمیان جو مشرق و مغرب کا تضاد ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ یہ تضاد کیوں کر اُٹھے گا اسے تو اصحاب معاملہ جانیں، ہمیں تو اس وقت اُنھی کارندوں میں سے ایک کارندے کا قصہ سنانا ہے۔ جسے مصنف نے یہ ظاہر کرنے کے لیے بیان کیا ہے کہ اُس طبقے کے ساتھ ''نانا میاں کا تعلق کتنا گہرا اور رازدارانہ تھا۔'' قصے کا آغاز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولانا عبدالرافع صاحب مرحوم (مصنف کے خالو) کا بیان ہے کہ مولانا (یعنی نانا میاں) کے گھر کا سودا میں ہی لایا کرتا تھا۔ سبزی ترکاری لائی ہوتی تو مولانا ایک خاص کنجڑے کا پتہ بتلاتے کہ وہیں سے لینا۔ اس کے یہاں اچھی ہو یا بری اُسی کے یہاں سے لینا۔''

(درسِ حیات، ص:۸۶)

اب پڑھنے کی چیز یہی ہے کہ وہ کنجڑا کون تھا اور اس میں کیا خصوصیت تھی۔ لکھا ہے کہ:

''مولانا عبدالرافع صاحب کا بیان ہے کہ میں نے عرض کیا کہ گیا کے انتظامی امور تو آج کل بہت خراب ہیں۔ آج کل یہاں کا صاحبِ خدمت کون ہے۔

مولانا خفا ہوئے کہ اس کو یہ بیماری ہے کہ بے فائدہ باتیں پوچھا کرتا ہے۔ مگر بہت سر چڑھا تھا بار بار اصرار کرتا ہی رہا کہ بتلا دیجیے۔

آخر مجبور ہو کر فرمایا کہ وہی کنجڑا ہے جس کے یہاں سے ترکاری لانے کے لیے تم کو تاکید کرتا رہتا ہوں اور تم ہمیشہ مجھ سے اس کے بارے میں حجت کرتے رہتے ہو۔ میں یہ سُن کر حیران رہ گیا کہ اللہ غنی! وہ کنجڑا اتنے درجے والا ہے؟''

(درسِ حیات، ص:۸۹)

مجھے اس واقعے کے ضمن میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہنا ہے کہ عالم کے انتظامات اور تکوینی اختیارات جب خدا ہی نے بنی نوع انسان میں سے اپنے چند کارندوں کے سپرد کر دیے ہیں تو اب اُنھیں کارساز و حاجت روا سمجھنے پر شرک کا الزام کیوں عائد کیا جاتا ہے۔ یہ بغاوت نہیں بلکہ عین وفاداری ہے کہ مالک کی طرف سے مقرر کیے ہوئے کارندوں کو ان کی منصبی حیثیت کے ساتھ عقیدۃً اور عملاً دونوں طرح تسلیم کیا جائے۔ کیوں کہ جس کے ہاتھ میں امور کا انتظام و انصرام ہوتا ہے، اپنی کاربرآری اور عقدہ کشائی کے لیے اس کی طرف رجوع کرنا دین و دیانت کا بھی تقاضا ہے اور عقل و فطرت کا بھی۔

اس واقعے میں اپنے مسلک سے انحراف اپنی جگہ پر ہے لیکن سب سے بڑا ماتم تو دل کی اس شقاوت کا ہے کہ اپنے ''نانا کا تقرب'' اور اقتدار ثابت کرنے کے لیے تو ایک کنجڑے تک کو کاروبارِ عالم میں دخیل مان لیا گیا لیکن ''حسنین کے نانا'' کے حق میں عقیدے کی جو زبان استعمال کی جاتی ہے وہ یہ ہے:

''جس کا نام محمد یا علی ہے وہ کسی چیز کا مختار نہیں۔''

(تقویۃ الایمان، ص:۴۲)

''سارا کاروبار جہان کا اللہ ہی کے چاہنے سے ہوتا ہے، رسول کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔''

(تقویۃ الایمان، ص:۵۸)

----------★★★----------

(۱۶)

مولوی خیر الدّین صاحب کے واقعات

(۱) اولاد کی لالچ میں عقیدۂ شرک سے مصالحت:

'درسِ حیات' کے مصنف اپنے والد کے متعلق ایک واقعہ نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''ابتدا میں (والد کی) کوئی اولاد زندہ نہیں رہتی تھی۔ کئی اولادیں ہوئیں مگر اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ خوبیِ قسمت سے ایک عالم پنجابی جو بہت بڑے عامل بھی تھے، گیا تشریف لائے، مولانا نے اولاد زندہ نہ رہنے کا حال ان سے کہا۔

انھوں نے کہا کہ ایک عمل ہے اس کو کیجیے انشاء اللہ اولادِ نرینہ ہوگی اور زندہ رہے گی۔ جب حمل کو چوتھا مہینہ ہو تو حاملہ کے پیٹ پر اپنی انگلی سے بغیر روشنائی کے ''محمد'' لکھ دیجیے اور پکار کر کہیے ''میں نے تیرا نام محمد رکھا'' اور جب بچہ پیدا ہو تو اس کا نام محمد رکھیے۔ چنانچہ اس عمل کے بعد سب سے پہلی اولاد جو پیدا ہو کر زندہ رہی وہ میں یعنی قاری فخرالدین مصنف کتاب ہوں۔''

(درسِ حیات، ص:۱۹۶)

غائب از نظر کو خطاب اور ندا دیوبندی مذہب میں شرک ہے۔ لیکن اولاد کی لالچ میں یہاں کوئی الجھن پیش نہیں آئی کہ ''میں نے تیرا نام محمد رکھا'' میں غائب کو خطاب کیوں کر درست ہے۔

اور سب سے بڑا قلق تو اس احسان فراموشی کا ہے کہ جس اعتقاد کی بدولت زندگی جیسی نعمت میسّر آئی اسی کو غلط اور شرک ثابت کرتے ہوئے ذرا کفرانِ نعمت کا خیال ان حضرات کو نہیں آتا۔ اور واقعہ سر سے گزر جانے کے باوجود انھیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ جب ''اسم'' کا تصرف یہ ہے کہ وہ حیات بخش ثابت ہوا تو ''مسمّٰی'' کے تصرفات کا کون اندازہ لگا سکتا ہے؟

(۲) تصرف وغیب دانی کا بے مثال واقعہ:

'درسِ حیات' کے مصنف نے تحصیل علم کے سلسلے میں اپنے والد کا ایک سفر نامہ نقل کیا ہے۔ واقعات کے راوی خود مصنف کے والد ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ہم اپنے چند رفقا کے ساتھ تحصیل علم کے لیے اپنے گھر سے نکلے اور کئی دن تک شبانہ روز چلتے رہے۔

''یہاں تک کہ ہم دوپہر کو ایک شہر میں داخل ہوئے۔ معلوم ہوا کہ یہ کرنال ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ سب سے پہلے ظہر کی نماز کس مسجد میں ہوتی ہے۔ اس مسجد میں جاکر نماز ظہر باجماعت ادا کی۔ نماز کے بعد مسجد سے نکلا کہ جلدی شہر سے نکلوں تاکہ راستہ کھوٹا نہ ہو۔

مسجد سے لگے ہوئے برآمدے میں ایک نابینا حافظ صاحب بیٹھے تھے میں جب اُن کے قریب سے گزرا تو انھوں نے کہا خیر الدین السلام علیکم! میرے پاس آؤ۔

میں نے یہ خیال کر کے فضول باتوں میں میرا وقت ضائع کریں گے ان کی اس بات کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور سرسری جواب دیتے ہوئے تیزی سے نکل گیا۔ انھوں نے اپنے چند شاگردوں کو میرے پیچھے دوڑایا کہ پکڑ لے آؤ مگر وہ مجھ کو پکڑ نہ سکے۔ میں سب سے قوی تھا سب کو جھٹک کر دور پھینک دیا اور آگے بڑھتا رہا۔''

(درسِ حیات، ص:۱۵۵)

یہاں تک کہ میں شہر پناہ کے پھاٹک سے جیسے ہی باہر نکلا اچانک زمین نے میرے قدم تھام لیے۔ بہت کوشش کی لیکن ذرا بھی قدم آگے نہیں بڑھ سکا۔ میرے ساتھیوں نے بھی مل کر بہت زور لگایا لیکن وہ بھی میرے قدموں کو زمین کی گرفت سے آزاد نہیں کرا سکے۔ یہاں تک کہ مجبور ہو کر میں شہر کی طرف واپس لوٹ آیا اور وہیں سے اپنے ساتھیوں کو رخصت کر دیا۔

''شہر میں آنے کے بعد مجھ کو خیال ہوا کہ وہ نابینا حافظ جی کون تھے؟

جنھوں نے باوجود ناواقف، اجنبی اور نابینا ہونے کے مجھ کو میرا نام لے کے پکارا۔ چلوں ان سے تحقیق حال کروں۔ میں جب ان کے پاس پہنچا تو وہ زور سے ہنسے اور کہا آخر آگئے بہت جان چھڑا کر بھاگے تھے۔ میں نے ان سے کہا ان باتوں کو چھوڑیئے، آپ یہ بتلایئے کہ آپ نے مجھ کو کیسے پہچانا اور میرا نام آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ انھوں نے فرمایا کہ تمہارا نام؟ مجھ کو تمہارا حال معلوم ہے کہ کس غرض سے نکلے ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ جس طرح تم اِدھر رو کے گئے ہو اُدھر نہیں رو کے جاؤ گے؟ تمہارے علم کا ایک حصہ اس شہر میں مقدر ہے جب تک تم اس کو حاصل نہیں کرو گے اس شہر سے نکل نہیں سکتے۔"

(درسِ حیات، ص:۱۵۶)

اس کہانی میں نابینا حافظ کا کردار نہایت واضح طور پر دیوبندی مذہب کو جھٹلا رہا ہے کیوں کہ کسی نابینا شخص کا صرف قدموں کی آہٹ پا کر ایک بالکل اجنبی آدمی کو پہچان لینا اور اس کا نام لے کر پکارنا اور یہ دعویٰ کرنا کہ نام ہی نہیں مجھے تمہارا حال اور مقصد سفر تک معلوم ہے۔ پھر تقدیر کا یہ نوشتہ بتانا کہ اس شہر میں تمہارے لیے علم کا ایک حصّہ مقدر ہے اور اس شہر سے اس وقت تک تم نہیں نکل سکتے جب تک کہ اُسے حاصل نہ کرلو۔ یہ سارے اُمور وہ ہیں جنھیں دیوبندی مذہب میں صرف خدا کا حق تسلیم کیا گیا ہے اور بڑے سے بڑے بندے کے حق میں اس طرح کی باتوں کے اعتقاد کو شرک جلی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ٹھیک ہی کہا ہے کسی نے کہ دنیا میں قاتلوں کی کمی نہیں ہے لیکن علمائے دیوبند پر اپنے مذہبی اصولوں کے قتل کا الزام تاریخ کا بدترین الزام ہے۔

(۳) تصرف وغیب دانی کا ایک اور حیرت انگیز واقعہ:

مصنف نے اپنی کتاب میں اپنے والد کے سفر کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک بار اپنے پیر و مرشد سے ملاقات کے لیے وہ سُوات جارہے تھے۔ جو سندھ کے اطراف میں واقع

ہے۔ درمیان میں پہاڑوں اور صحراؤں کا ایک طویل سلسلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ چلتے چلتے جب وہ ایک پہاڑ کی گھاٹی میں پہنچے تو وہاں کا راستہ اتنا تنگ اور دشوار گزار تھا کہ گدھے کی سواری کے بغیر اسے عبور کرنا ناممکن تھا۔

اب اس کے بعد کا واقعہ خود مسافر کی زبانی سُنیے۔ لکھا ہے کہ:

"میں گدھے پر سوار تھوڑا ہی آگے بڑھا ہوں گا کہ ایک درہ سے ڈاکوؤں کا ایک گروہ نکلا اور اس نے مجھ کو بہت تنگ کیا۔ میرے پاس جو کچھ تھا سب رکھوالیا اور اس کے بعد جان کی باری تھی۔ رحم کا کوئی شائبہ ان کے اندر نہ تھا۔

میں نے پریشانی کے عالم میں سر جھکا لیا اور عمل برزخ "تصور شیخ" کا عمل کیا۔

اب کیا دیکھتا ہوں کہ وہی ظالم ڈاکو سراپا رحم و کرم بنے ہوئے تھر تھر کانپ رہے ہیں۔ کوئی قدم چومتا ہے کوئی ہاتھ چومتا ہے۔"

(درسِ حیات، ص:۱۷۲)

اس کے بعد لکھا ہے کہ انھی لوگوں میں ڈاکوؤں کا سردار بھی تھا وہ مجھے اپنے گھر لے گیا اور میری بڑی خاطر مدارات کی۔ وہ لوگ بار بار مجھ سے معافی مانگتے تھے اور اقرار لیتے تھے کہ میں نے انھیں معاف کردیا۔ میں نے حیرانی کے عالم میں ان سے دریافت کیا کہ پہلے تم لوگوں نے میرے ساتھ وہ معاملہ کیا اور اب اچانک کیا بات ہوگئی کہ تم میرے حال پر اس قدر مہربان ہوگئے ان لوگوں نے جواب دیا کہ:

"حضرت! ہم نے آپ کو پہچانا نہ تھا۔ جب آپ آنکھ بند کر کے سر جھکائے بیٹھے تھے اُس وقت ہم نے آپ کو غور سے دیکھا تو پہچانا کہ آپ تو حضرت میاں صاحب ہیں۔"

(درسِ حیات، ص:۱۷۳)

اب اس کے بعد بیان کرتے ہیں، بیان نہیں کرتے دیوبندی مکتبِ فکر کے لٹریچر میں آگ لگاتے ہیں:

اب میری سمجھ میں آیا کہ تصور شیخ کی برکت سے حضرت کی توجہ خصوصی مبذول

ہوکر میری صورت حضرت پیر ومرشد کی صورت سے تبدیل ہوگئی۔ جس کی مجھ کو خبر بھی نہ تھی اور ان ڈاکوؤں کے کہنے سے یہ عقدہ کھلا۔"

(درسِ حیات، ص:۱۷۳)

یہاں تک تو راستے کا حال بیان ہوا اب پیر صاحب کے دربار کا قصہ سنیے اور غیبی قوتِ ادراک کی ایک اور شان دیکھیے۔ لکھا ہے کہ:

"حضرت نے مجھ کو دیکھ کر فرمایا کہ بندۂ خدا! آنا ہی تھا تو مجھ کو اطلاع کر دیتے میں ڈاکوؤں کے سردار کو خبر کرا دیتا تو پھر کوئی خطرہ پیش نہ آتا۔ یہ راستہ بہت خطرناک ہے اللہ کا فضل ہوا کہ بچ کر چلے آئے۔"

(درسِ حیات، ص ۱۷۴)

اب اپنے حضرت کی غیب دانی کا ایک اور اعتراف ملاحظہ فرمایئے۔ بیان کرتے ہیں کہ:

"(حضرت) دیر سے منتظر بیٹھے تھے۔ اور میرے لیے کھچڑی پکوا کر رکھی تھی چونکہ اس وقت میرے معدہ میں کچھ گڑبڑی تھی۔ حالانکہ میں نے اس کی کوئی اطلاع نہیں کی تھی۔ بڑی شفقت سے مجھ کو کھچڑی کھلائی۔"

(درسِ حیات، ص:۱۷۴)

غور فرمایئے! اس ایک واقعے میں اپنے حضرت کے متعلق غیب دانی اور تصرف کے کتنے دعوے کیے گئے ہیں۔

پہلا دعویٰ تو یہی ہے کہ پہاڑ کی گھاٹی میں میلوں کی مسافت سے تصور کی خاموش زبان کا استغاثہ اُنھوں نے سُن لیا اور وہیں سے بیٹھے بیٹھے اپنی صورت بھی مرید کی صورت پر چسپاں کر دی اور یہ اُس وقت تک چسپاں رہی جب تک کہ مرید اپنے گھر تک نہیں پہنچ گیا۔

دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ پہاڑ کی گھاٹی میں مرید کو جو حادثہ پیش آیا غیبی طور پر اس کی جملہ تفصیلات پیر صاحب کو معلوم ہوگئیں، جبھی تو پہنچتے ہی انھوں نے فرمایا "بندۂ خدا! آنا ہی تھا تو مجھے اطلاع کر دیتے میں ڈاکوؤں کو خبر کر دیتا تو پھر کوئی خطرہ پیش نہ آتا۔"

تیسرا دعویٰ یہ ہے کہ غیبی علم کے ذریعے پیر صاحب کو اس بات کی بھی خبر ہوگئی کہ آنے والے مرید کا معدہ خراب ہوگیا ہے۔ اس لیے پہلے ہی سے کھچڑی پکوا کر تیار رکھی تھی۔

سوچتا ہوں تو آنکھوں میں خون تیرنے لگتا ہے کہ یہ حضرات اپنے گھر کے بزرگوں کے متعلق جو کچھ بیان کرتے ہیں اگر یہی امر واقعہ ہے اور یہی ایمانی حقیقتوں کی صحیح تعبیر ہے تو پھر سو برس سے انبیا و اولیا کے بارے میں عقائد کی جو جنگ لڑی جا رہی ہے آخر اس کا پس منظر کیا ہے؟

کتنا سنگین مذاق ہے یہ اہلِ اسلام کے ساتھ کہ صرف جی بہلانے کے لیے اُن کے جذبات سے کھیلا جا رہا ہے۔

دیوبندی مکتبِ فکر کا وہ لٹریچر جو کفر و شرک کی تعزیرات پر مشتمل ہے خانقاہوں میں تو پہلے ہی سے ناپسندیدہ تھا اب جب کہ اپنے گھر میں بھی وہ قابلِ عمل نہیں رہا تو اسے باقی رکھنے کی معقول وجہ کیا ہے؟

میرا سوال دیوبندی جماعت کے سارے اصاغر و اکابر سے ہے کوئی صاحب بھی معقول جواب دے کر میری تشفی کر دیں تو میں ساری زندگی ان کا شکر گزار رہوں گا۔

(۴) باپ کی غیب دانی کا قصہ:

اب تک تو دوسروں کی بات چل رہی تھی اب خود مُصنف کے "والد بزرگوار" کی غیب دانی کا قصہ سنیے۔ تحریر فرماتے ہیں کہ:

"میرے چھوٹے بھائی قاری شرف الدین کا بیان ہے کہ مولانا وضو کر کے مصلے پر دونوں ہاتھ کانوں تک اُٹھا چکے تھے کہ میں نماز کی تیاری کی بجائے یہ سمجھ کر اُن کے پیچھے کھیل میں مشغول ہوگیا کہ اب تحریمہ باندھ کر نماز میں دیر تک مشغول رہیں گے اور ان کو میرے کھیل کی خبر نہ ہوگی۔ لیکن اُن کو فوراً کشف ہوگیا اور اچانک ہاتھ کانوں سے ہٹا کر پیچھے مڑ کر دیکھا اور مجھ کو زور سے ڈانٹا۔"

(درسِ حیات، ص:۲۲۶)

اس واقعے کے بیان میں ذرا جذبۂ عقیدت کا یہ تصرف ملاحظہ فرمائیے کہ تحریمہ باندھتے وقت پیچھے پلٹ کر دیکھنا اتفاقاً بھی ہوسکتا ہے اور اس غرض سے بھی ہوسکتا ہے کہ صفیں سیدھی ہوگئیں یا نہیں، لیکن مصنّف کا اصرار ہے کہ میرے والد نے صرف اس لیے پیچھے پلٹ کر دیکھا کہ انھیں اپنی غیبی قوت ادراک کے ذریعے سے معلوم ہوگیا تھا کہ پیچھے کی صف میں بھائی کھیل رہا ہے۔

مجھے کہنے دیجیے کہ باپ کو غیب داں ثابت کرنے کے لیے جو جذبۂ عقیدت یہاں کارفرما ہے اگر اس کا ہزارواں حصہ بھی رسول عربی ﷺ کے لیے دل کے کسی گوشے میں موجود ہوتا تو عقائد کا یہ اختلاف جس نے اُمّت کو دو حصّوں میں تقسیم کردیا ہے، ہرگز وجود میں نہ آتا۔

ہزار تاویلات کے باوجود دیوبندی لٹریچر کے ذریعے یہ حقیقت اب اتنی واضح ہوگئی ہے کہ ملّت کا انصاف پسند طبقہ حالات کا یہ کرب محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ایک بات کی وضاحت:

اس کتاب میں دیوبندی لٹریچر کے حوالے سے کشف کا ذکر بار بار آیا ہے اس لیے میں اسے واضح کردینا چاہتا ہوں کہ دیوبندی مذہب میں کشف کا دعویٰ کہاں تک درست ہے؟

لہٰذا اس کے لیے دیوبندی مذہب کی الہامی کتاب 'تقویۃ الایمان' کا یہ فرمان ملاحظہ فرمائیے:

''اس آیت سے معلوم ہوا کہ یہ سب جو غیب دانی کا دعویٰ کرتے ہیں کوئی کشف کا دعویٰ کرتا ہے کوئی استخارہ کا عمل سکھاتا ہے یہ سب جھوٹے ہیں اور دغاباز، ان کے جال میں ہرگز نہ پھنسنا چاہیے۔''

(تقویۃ الایمان، ص:۲۳)

تقویۃ الایمان کی نشاندہی کے بعد دیوبندی گروہ کا کوئی شخص اپنے یا اپنے کسی بزرگ کے لیے کشف کا دعویٰ کرتا ہے تو اب اس کے متعلق اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ وہ جھوٹا ہے، دغاباز ہے، اس کے جال میں ہرگز نہ پھنسنا چاہیے۔

-----------★★★-----------

(۱۷)

مولانا بشارت کریم صاحب کے واقعات

(۱) کبریائی اختیارات کی کہانی:

موصوف گڑھول نام کی ایک بستی کے رہنے والے ہیں جو ضلع مظفر پور بہار میں واقع ہے۔ ''درسِ حیات'' کے مصنّف نے اپنے استاد اور ایک مخدوم بزرگ کی حیثیت سے ان کا تذکرہ نہایت عقیدت کے ساتھ کیا ہے۔

ان کے دربار کے ایک حاضر باش پنڈت کے بارے میں اُنھوں نے ایک عجیب واقعہ لکھا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ لکھا ہے کہ پنڈت جی کسی مرشد کامل کی تلاش میں اِدھر اُدھر مارے مارے پھر رہے تھے کہ اچانک کسی مجذوب عورت سے ان کی ملاقات ہوگئی۔ اس نے گڑھول کا پتہ بتایا کہ وہاں جا! وہاں تیرے درد کا درماں ہے۔ اب وہ گڑھول کا راستہ معلوم کرکے وہاں کے لیے روانہ ہوئے۔ اس کے بعد کا واقعہ خود مُصنّف کی زبانی سُنیے۔ لکھا ہے کہ:

''دوپہر کا وقت تھا اور گرمی کا زمانہ تھا۔ جو گیارہ اسٹیشن سے پیدل گڑھول جارہے تھے۔ گرمی کے دنوں میں دوپہر کے وقت لوگ عموماً گھروں کے اندر پناہ گزیں ہوتے ہیں۔ باہر راستے میں چلتے ہوئے لوگ نہیں ملتے۔ یہ کئی جگہ راستہ بھولے اور ہر جگہ ایک ہی صورت کے ایک ہی شخص نے ظاہر ہوکر راستہ بتلادیا۔''

(درسِ حیات، ص:۲۹۹)

اب اس کے بعد کا قصہ سنیے۔ بیان کے اس حصّے میں مُرشدِ کامل کی قوتِ تصرف اور غیب دانی کا منصب کبریائی خاص طور پر محسوس کرنے کے قابل ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں:

''جب گڑھول پہنچے اور حضرت کے جمالِ جہاں آرا پر نظر پڑی تو دیکھا کہ یہ تو

وہی ہیں جنھوں نے راستے میں کئی جگہ ظاہر ہو کر رہنمائی فرمائی تھی۔ عقیدت جوش میں آئی۔ بے اختیار عرض کیا بادشاہ! میرے حال پر رحم کیجیے اور مجھ کو راستہ بتلائیے۔"

(درسِ حیات، ص:۳۰۰)

گفتگو کا یہ حصہ نیاز مند اور باغی ذہن کا فرق اچھی طرح واضح کر دیتا ہے۔ فطرتِ انسانی کا یہ نکتہ اگر سمجھ میں آ گیا تو نظر کے بہت سارے حجابات خود بخود اُٹھ جائیں گے:

> "حضرت نے پوچھا کیا بات ہے؟ کیا چاہتے ہو؟ عرض کیا کہ گڑھول آتے ہوئے جہاں کہیں راستہ بھولا تو بادشاہ! آپ نے ظاہر ہو کر راستہ بتلایا۔ اب آپ پوچھتے ہیں کہ میں کیا چاہتا ہوں؟ آپ کو سب معلوم ہے کہ میں کیا چاہتا ہوں۔"

(درسِ حیات، ص:۳۰۰)

یہ واقعہ پڑھ کر ہر غیر جانب دار ذہن کو جن سوالات کا سامنا کرنا پڑے گا وہ یہ ہیں:

پہلا سوال تو یہ ہے کہ اگر "حضرت" غیب داں نہیں تھے تو گھر بیٹھے انھیں کیوں کر معلوم ہو گیا کہ ایک جوگی میرے دربار میں آتے ہوئے راستہ بھول گیا ہے چل کر اس کی رہنمائی کی جائے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ راستہ بھولنے کا واقعہ کئی بار پیش آیا اور ہر بار یہ اس مقام پر پہنچ گئے جہاں راستہ گم ہو گیا تھا۔ اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی خانقاہ میں بیٹھے ہوئے جوگی کی ایک ایک نقل و حرکت دیکھ رہے تھے اور جہاں ضرورت سمجھتے تھے فوراً رہنمائی کے لیے پہنچ جاتے تھے۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ راستہ بتانے کے لیے جوگی کے سامنے ایک ہی شکل و صورت کا شخص بار بار نمودار ہوا وہ کون تھا؟ آیا وہ خود "حضرت" تھے یا کوئی اور تھا؟ اگر وہ خود حضرت تھے تو بجلی کی طرح یہ سُرعت رفتار انھیں کیوں کر میسّر آئی کہ مسافر ابھی راستے ہی میں تھا اور یہ کئی بار آئے

بھی اور گئے بھی۔ اور اگر وہ "حضرت" نہیں تھے بلکہ کوئی اور تھا تو بالکل "حضرت" کی طرح یہ دوسرا "وجود" کس کے تصرف کا نتیجہ تھا۔

چوتھا سوال یہ ہے کہ جوگی نے جب یہ کہا کہ بادشاہ! گڑھول آتے ہوئے جہاں کہیں ہم بھولے آپ نے ظاہر ہو کر راستہ بتایا اس کے بعد بھی آپ پوچھتے ہیں کہ میں کیا چاہتا ہوں؟ آپ کو سب معلوم ہے کہ میں کیا چاہتا ہوں؟ تو انھوں نے رسماً بھی یہ نہیں کہا کہ اسلام میں کسی مخلوق کے لیے اس طرح کا عقیدہ رکھنا شرک ہے۔ یہ صرف خدا کا حق ہے۔ جب ہم اپنے پیغمبر کے بارے میں اس طرح کا اعتقاد خلافِ حق سمجھتے ہیں تو میرے متعلق یہ اعتقاد کیوں کر درست ہوگا۔

ان سوالات کے جواب کے لیے میں آپ سے آپ ہی کے ضمیر کا انصاف چاہتا ہوں۔

(۲) باطنی مشاہدات کا ایک حیرت انگیز واقعہ:

اپنے حضرت کی غیبی قوتِ ادراک کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کتاب کے مصنف اپنے والد سے ایک روایت نقل کرتے ہیں:

> "والد صاحب مرحوم نے ایک مرتبہ فرمایا کہ حضرت مولانا بشارت کریم صاحب فرماتے تھے کہ میں نے بارہا آپ کے قلب پر نظر کی تو اس کو آپ کے شیخ کی توجہات سے معمور و مربوط پایا۔ آپ کے شیخ کا پورا قبضہ آپ کے قلب پر ہے اور آپ کے قلب کا پورا رابطہ شیخ کے ساتھ ہے۔
>
> سبحان اللہ! کشفِ قلوب کی کتنی عجیب مثال ہے یہ واقعہ؟"

(درسِ حیات، ص:۳۳۲)

داد دیجیے اس نظر کو جو ایک طرف سینہ چاک کرتی ہوئی مرید کے قلب تک جا پہنچی اور قلب میں شگاف ڈال کر اندر کا سارا حال دیکھ لیا اور دوسری طرف باطنی توجہ کا وہ طویل سلسلہ بھی دیکھ آئی جو سیکڑوں میل کی مسافت پر شیخ کے قلب کے ساتھ منسلک تھا اور پھر طرفہ تماشا یہ ہے کہ نگاہ کا یہ عمل

کچھ ایک ہی بار نہیں پیش آیا کہ اُسے حُسنِ اتفاق کا نتیجہ کہہ کر بات رفع دفع کر دیجیے۔ بلکہ بیان کی صراحت کے مطابق بار ہا ایسا ہوا اور جب بھی چاہا ہوتا رہا۔

معاذ اللہ! جذبۂ عقیدت کا تصرف بھی کتنا پُر آشوب ہوتا ہے؟ ایک ادنیٰ اُمتی کے لیے تو زبان وقلم کا یہ اعتراف ہے اور رسول انور ﷺ کے حق میں سارا قبیلہ متفق ہے کہ اُن کی نظر پسِ دیوار بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔

(۳) ایک مجذوب کا قصہ عجیب:

درسِ حیات کے مصنّف نے اپنے ایک رفیقِ تعلیم کے حوالے سے ایک مجذوب کا قصہ بیان کیا ہے۔ لکھا ہے کہ جنگ پور روڈ ضلع مظفر پور میں جہاں ان کے رفیقِ تعلیم کا گھر تھا ایک مجذوب رہا کرتا تھا۔ اس سے ان کی اچھی خاصی شناسائی تھی۔ ایک دن رات کے وقت استنجے کے لیے گھر سے باہر نکلے، دیکھا کہ وہ مجذوب ان کے سامنے سے گزر رہا ہے۔ وہ بھی اس کے پیچھے لگ گئے۔ بستی سے باہر نکل کر کچھ دور چلنے کے بعد مجذوب رُک گیا اور گڑھول (جہاں مولانا بشارت کریم صاحب کا گھر تھا) کی طرف رخ کر کے اُن سے کہنا شروع کیا:

''ارے دیکھو! اُدھر دیکھ! وہ دیکھ! گڑھول میں مولانا بشارت کریم صاحب ذکر کر رہے ہیں اور اُن کے مکان پر انوار کی بارش ہو رہی ہے اور ان کے مکان سے عرش تک نور ہی نور ہے۔''

(درسِ حیات، ص:۳۴۲)

اسے مجذوب کی بڑ کہہ کر آپ گزر بھی جانا چاہیں تو ''دانش ورانِ دیوبند'' کے اس اعتراف کو کیا کیجیے گا جس کے لفظ لفظ سے یقین کا تیور جھلک رہا ہے:

اللہ اللہ! یہ ہے ذکر اور یہ ہیں ذاکر، جن کے انوار کا کوئی آنکھ والا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ نہ صرف قریب سے بلکہ آٹھ نو میل کی دوری سے اس طرح مشاہدہ کر سکتا ہے کہ جیسے کسی محسوس چیز کو بہت قریب سے کوئی دیکھ رہا ہو۔''

(درسِ حیات، ص:۳۴۲)

جی چاہتا ہے کہ اس مقام پر پھر میں آپ کے جذبۂ انصاف کو آواز دوں کہ سرکارِ کونین ﷺ کے حق میں تو علم پسِ دیوار کا عقیدہ دانشورانِ دیوبند کے حلق کے نیچے اب تک نہیں اُتر سکا۔ لیکن ایک مجذوب کے حق میں دل کا یہ یقین ملاحظہ فرمایئے کہ نو میل کے فاصلے سے اندھیری رات میں فرش سے عرش تک غیبی انوار وتجلیات کا وہ اس طرح مشاہدہ کر رہا ہے جیسے کسی محسوس چیز کو بہت قریب سے کوئی دیکھتا ہے۔ نہ درمیان کے حجابات اس کی نظر پر حائل ہوتے ہیں اور نہ رات کی تاریکی مانع ہوتی ہے۔

حیرت ہوتی ہے دیوبندی ذہن کی اس بوالعجبی پر کہ علم وادراک کی جو قوت وہ ایک ادنیٰ اُمتی کے حق میں تسلیم کر لیتے ہیں اسے اپنے رسول کے حق میں تسلیم کرتے ہوئے اُنھیں شرک کا آزار کیوں ستانے لگتا ہے۔

علمائے دیوبند کا یہی زاویۂ فکر ہے جہاں سے واضح طور پر ہمیں یہ محسوس کرنے کا موقع ملتا ہے کہ اپنے اور بے گانے کے درمیان جوہری فرق کیا ہوتا ہے؟ اور حالات وواقعات پر اس کا اثر کیا پڑتا ہے۔

(۴) عقیدوں کا خون:

مولوی عبد الشکور نام کے کوئی صاحب مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں مدرس تھے۔ موصوف مولانا بشارت کریم صاحب کے خاص مُریدوں میں تھے۔ اُن کے متعلق درسِ حیات کے مصنف نے لکھا ہے کہ وہ ایک بار اپنے شیخ کی بارگاہ میں یہ خیال لے کر روانہ ہوئے کہ حضرت سے دریافت کروں گا کہ بعض بزرگوں کے متعلق جو یہ سنا ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں کئی کئی جگہ موجود ہو جاتے تھے تو اس کی حقیقت کیا ہے؟ اب اس کے بعد کا قصہ خود مُرید کی زبانی سُنیے۔ بیان کرتے ہیں کہ:

''جب (وہاں) پہنچا تو نماز کا وقت تھا۔ اس زمانے میں خود حضرت نماز پڑھایا کرتے تھے۔ میں بھی جماعت میں شریک ہوا۔ نماز شروع ہوتے ہی مجھ پر ایک

کیفیت طاری ہوئی اور میں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا میدان ہے اور اس وسیع میدان میں جابجا متعدد جماعتیں صف بستہ نماز میں مشغول ہیں اور ہر جماعت کے امام حضرت ہیں اور سارے کے سارے مقتدی ہر جماعت میں وہی ہیں جو اس جماعت میں تھے جس میں شامل ہو کر میں حضرت کے پیچھے نماز پڑھ رہا تھا۔

یہ دیکھ کر آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا۔ میرے سوال کا جواب مجھ کو مل گیا۔ سارے شبہات کا ازالہ ہو گیا۔ حضرت کے روحانی تصرف نے ایسا مشاہدہ کرادیا کہ پھر حضرت سے پوچھنے اور سمجھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔''

(درسِ حیات، ص:۳۵۴)

''مجھ پر ایک کیفیت طاری ہوئی۔'' سے مراد نیند نہیں ہے کہ اس واقعہ کو آپ خواب کی بات کہہ کر گزر جائیں بلکہ عین حالت بیداری میں اُنھوں نے غیبی تصرف کا یہ تماشا دیکھا۔

اس واقعے میں ایک طرف حضرت کی غیبی قوت ادراک کا یہ کرشمہ دیکھیے کہ عین نماز کی حالت میں اُنھوں نے اپنے مُرید کا وہ خیال تک معلوم کرلیا جسے وہ اپنے دل میں چھپا کر لائے تھے اور معاً یہ بھی دریافت کرلیا کہ عقدہ کشائی کا طلب گار صف میں میرے پیچھے کھڑا ہے اور دوسری طرف کمال تصرف ملاحظہ فرمائیے کہ نماز شروع ہوتے ہی طلسم ہوشربا کی طرح اُنھوں نے اپنے مرید کو ایک میدان میں پہنچادیا اور وہاں صاف صاف مشاہدہ کرادیا کہ ایک شخص ایک ہی وقت میں متعدد جگہ کیوں کر موجود ہو سکتا ہے۔

یہ واقعہ اگر صحیح ہے تو مجھے کہنے دیجیے کہ دیوبندی مذہب کا جھوٹ فاش کرنے کے لیے اب کسی نئی تصنیف کی حاجت نہیں ہے۔ خود دیوبند کے اہلِ قلم اس خدمت کے لیے بہت کافی ہیں۔

(۵) ایک اور حشر برپا کہانی:

درسِ حیات کے مصنف نے ایک ''معتبر راوی'' کے حوالے سے اسی مذکور الصدور پنڈت کا ایک اور حیرت انگیز قصہ بیان کیا ہے۔ اس معتبر راوی کا بیان ہے کہ ''حضرت'' کے حجرۂ

خاص میں میرے اور پنڈت جی کے سوا کسی کو بھی باریاب ہونے کی اجازت نہیں تھی۔

راوی کہتا ہے کہ ایک دن بعد مغرب اپنے حجرۂ خاص میں حضرت تلاوت فرما رہے تھے ایک گوشے میں پنڈت جی مراقب تھے اور دوسرے گوشے میں میں بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک پنڈت جی چیخے، پھر تڑپے پھر بے ہوش ہو گئے۔ حضرت تلاوت روک کر ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ جب اُنھیں ہوش آیا تو دریافت فرمایا کہ کیا بات ہے؟ کیا دیکھا؟ اب ''کیا دیکھا'' کی تفصیل خود راوی کی زبانی سنیے:

''پنڈت جی نے عرض کیا کہ بادشاہ! میں نے دیکھا کہ قیامت قائم ہے میدانِ حشر میں حق تعالیٰ عرش پر جلوہ گر ہے۔ حساب و کتاب ہو رہا ہے، مخلوق کا بے پناہ ہجوم ہے۔ آپ بھی ہیں، میں بھی ہوں، آپ مجھ کو پکڑے ہوئے عرش الٰہی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ جب قریب پہنچ گئے تو آپ نے مجھ کو دونوں ہاتھوں سے اُٹھایا اور عرش الٰہی کی طرف بڑھایا میں حق تعالیٰ کے جلالِ ہیبت و عظمت سے چیخ اُٹھا۔''

(درسِ حیات، ص:۳۰۴)

یہ تو رہا پنڈت جی کا مشاہدہ! لیکن ''حضرت'' نے جن الفاظ میں اس کی توثیق فرمائی ہے وہ بھی پڑھنے کی چیز ہے۔ راوی کا بیان ہے کہ:-

(''حضرت نے یہ سُن کر حسبِ عادت تھوڑا سا سکوت فرمایا اور پھر ٹھنڈی سانس لے کر فرمایا مبارک ہو نور اللہ! (پنڈت جی کا نیا نام) اس سے بڑھ کر اور کیا چاہتے ہو۔''

(درسِ حیات، ص:۳۰۴)

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ! نومسلم پنڈت کا مقام عرفان تو اپنی جگہ پر ہے لیکن سچ پوچھیے تو اس واقعے کا سارا کریڈٹ ''حضرت'' کو ملنا چاہیے جن کے فیضانِ صحبت نے ایک نومسلم پنڈت کو عالمِ غیب کا محرم بنادیا۔ یہاں تک کہ وہ غیب الغیب ذات بھی اس کی نظر سے نہیں چھپ سکی جسے گیتی پر حالتِ

بیداری میں آج تک کسی نے نہیں دیکھا ہے۔

اب آپ ہی ہماری مظلومی کے ساتھ انصاف کیجیے کہ اتنا کھلا ہوا شرک دیوبند کے ان پارساؤں نے اپنے حلق کے نیچے اُتار لیا پھر بھی اُن سے کوئی باز پرس کرنے والا نہیں ہے۔ اور ہم ایمان کا مظاہرہ کرتے ہیں تو ہمارے لیے قتل کی تجویز ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

(۲) حضرت کی قبر کے عجائب وغرائب:

اب تک تو حضرت کی حیاتِ ظاہری کے قصے آپ سُن رہے تھے اب ان کی وفات کے بعد کے دو قصے اور سُنیے۔ درسِ حیات کے مُصنف ان کی قبر کے تصرفات کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وصال کے بعد ایک مدت تک مزار شریف پر لوگوں کا ہجوم رہنے لگا اور پانی، تیل، نمک وغیرہ قبر شریف کے پاس لے جا کر لوگ رکھ دیتے اور کچھ دیر کے بعد اُٹھا لیتے۔ اس سے بکثرت لوگوں کو فوراً فوائد حاصل ہوئے۔"

(درسِ حیات، ص: ۳۵۷)

یہ تو رہا 'صاحبِ قبر کا تصرف' اب قبر کی مٹی کا تصرف ملاحظہ فرمایئے۔ لکھتے ہیں:

"وصال کے بعد لوگوں کا ہجوم جو مزار کے پاس آیا وہ پانی وغیرہ رکھنے یا یوں کہیے کہ دم کرانے کے بعد تھوڑی تھوڑی مٹی بھی ہر ایک اُٹھا کر لے جانے لگا۔ چنانچہ چند روز میں ضرورت پڑ جاتی کہ دوسری مٹی مزار شریف پر ڈالی جائے۔ چنانچہ مولانا ایوب صاحب مرحوم (حضرت کے صاحب زادے) کچھ عرصہ تک جب مٹی کم ہو جاتی نئی نئی مٹی ڈال دیا کرتے۔"

(درسِ حیات، ص: ۳۵۸)

لکھا ہے کہ مٹی ڈالتے ڈالتے جب صاحب زادے تنگ آ گئے اور روز روز کی یہ "فری ڈیوٹی" وبالِ جان ہو گئی تو ایک دن آزردہ خاطر ہو کر مزار شریف پر حاضر ہوئے اور نہایت ادب سے عرض کیا:

"حضرت! زندگی میں تو بہت سخت تھے مگر اب مزار شریف پر یہ کیا ہونے لگا ہے۔ اب میں آخری مرتبہ مٹی ڈال رہا ہوں۔ اس کے بعد اگر گڑھا بھی پڑ جائے گا تو اب میں مٹی نہیں ڈالوں گا۔ اس سلسلے کو بند کرایئے۔"

(درسِ حیات، ص: ۳۵۸)

"لختِ جگر" نے مچل کر کہا تھا آخر ناز اُٹھانا ہی پڑا۔ امیدوں کے بے شمار آبگینے ٹوٹ گئے لیکن "نورِ نظر" کا دل نہیں توڑا جا سکا۔ لکھا ہے کہ:

"اس کے بعد پھر کسی نے مٹی نہیں اُٹھائی۔ قطعاً وہ سلسلہ بند ہو گیا اور اب کبھی مٹی ڈالنے کی نوبت نہیں آئی۔ اور پانی، تیل، نمک وغیرہ مزار شریف پر رکھ کر دم کرانے کا خیال بھی اب کسی کو نہ پیدا ہوا اور وہ سلسلہ بھی موقوف ہو گیا۔"

(درسِ حیات، ص: ۳۵۸)

صاحب زادے نے جو کچھ کہا تھا وہ صاحبِ مزار سے کہا تھا، آنے والوں کو کس نے روکا کہ وہ یک لخت رُک گئے۔ اس لیے کہنا پڑے گا کہ یہ صاحبِ مزار کا تصرف تھا کہ جب تک چاہا میلہ لگا اور جب چاہا اُجڑ گیا۔ گویا اہلِ حاجت کے قلوب ان کے اپنے سینوں میں نہیں بلکہ صاحبِ مزار کی مٹھی میں بند تھے، بند کی تو جمع ہو گئے کھول دی تو بکھر گئے۔

اب اس واقعے کے چند اہم نکتوں پر میں آپ سے آپ ہی کے ضمیر کا انصاف چاہتا ہوں:

پہلا نکتہ تو یہ ہے کہ لحد کی آغوش میں اگر کوئی متحرک، با اختیار اور فیض بخش زندگی نہیں تھی تو صاحب زادے نے خطاب کس کو کیا تھا؟ درخواست کس سے کی تھی؟ اور کس کے تصرف سے اہلِ حاجت کا سلسلہ اچانک بند ہوا؟

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ مزار کے اردگرد صاحبِ مزار کی نسبت کا اثر اگر کارفرما نہیں تھا تو قبر کی مٹی اور اس کے قریب رکھے جانے والے تیل اور پانی سے بہ کثرت لوگوں کو فائدہ کیوں پہنچ رہا تھا؟

تیسرا نکتہ یہ ہے کہ صاحبِ مزار نے اپنی قوتِ تصرف سے جو سلسلہ بند کیا۔ اس کے

متعلق دریافت کرنا ہے کہ شریعت کی طرف سے بھی اس کے بند کرنے کا مطالبہ تھا یا نہیں؟ اگر تھا تو اس الزام کا کیا جواب ہے کہ شریعت کے کہنے پر تو نہیں کیا جب صاحب زادوے نے کہا تو بند کر دیا؟

چوتھا نکتہ یہ ہے کہ اپنی زندگی میں جب صاحبِ مزار کو یہ امور ناپسندیدہ تھے تو مرنے کے بعد کیوں کر پسندیدہ ہو گئے؟ آخر وہاں پہنچ کر حقیقت کا کون سا نیا عرفان حاصل ہوا جس نے عقیدے کا مزاج بدل دیا؟ اور جس مشرب کے خلاف ساری زندگی لڑتے رہے مرنے کے بعد اس کے ساتھ صلح کرنی پڑی؟

پانچواں نکتہ یہ ہے کہ صاحب زادگان و متعلقین کو اگر یہ بات پہلے ہی سے معلوم تھی کہ خلاف شرع ہونے کے باعث اہل حاجت کا یہ میلہ صاحب مزار کو پسند نہیں ہے تو انھوں نے دینی جذبے کے زیر اثر پہلے ہی دن اُسے کیوں نہیں روکا؟ جب مٹی ڈالتے ڈالتے تنگ آگئے تب روکنے کا خیال پیدا ہوا۔ اور وہ بھی خود نہیں بلکہ صاحبِ مزار سے درخواست کی کہ آپ روک دیجیے۔

چھٹا نکتہ یہ ہے کہ بیٹے کی ضد پر جس قوتِ تصرف سے صاحبِ مزار نے یہ سلسلہ بند کیا، وہ قوت دوسرے اصحابِ مزار کو بھی حاصل ہے یا نہیں؟ اگر حاصل ہے تو روکنے کی طاقت رکھتے ہوئے بھی جب وہ نہیں روکتے تو کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ لوگ ان تمام امور کو پسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہیں اور جب صالحین کے سارے گروہ اسے پسند کرتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اللہ و رسول کے نزدیک بھی وہ پسندیدہ نہ ہو۔

(۷) مرنے کے بعد قوت ادراک کا ایک اور قصہ:

درسِ حیات کے مصنف نے ”حضرت“ کی وفات کے بعد کا ایک قصہ اور بیان کیا ہے۔ لکھا ہے کہ ایک صاحب جو ”حضرت“ کے متوسلین میں ہیں ایک سخت مرض میں مبتلا ہوئے:

”جب ہر طرف سے علاج کر کے تھک گئے تو ایک روز حضرت کو خواب میں دیکھا۔ فرما رہے ہیں سلمان (حضرت کے صاحب زادوے) سے کہو

ہومیوپیتھک کی فلاں دوا فلاں نمبر کی دے دے۔

یہ صبح اٹھ کر سلمان بابو کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے مرض کا حال بیان کیا۔ وہ یونانی کے ساتھ ہومیوپیتھک علاج کرتے تھے۔ حالانکہ انھوں نے خواب کا واقعہ ابھی ذکر نہیں کیا تھا وہ اُٹھے اور الماری میں سے وہی دوا اس نمبر کی نکال کر ان کو دے دی جو حضرت نے فرمائی تھی۔“

(درسِ حیات، ص:۳۶۲)

بعد مرگ بھی اگر غیبی علم و ادراک کی قوت حضرت کو حاصل نہیں تھی تو انھوں نے قبر میں لیٹے لیٹے کیسے معلوم کر لیا کہ میرا فلاں مُرید سخت مرض میں مبتلا ہو گیا ہے اور یہ بھی معلوم کر لیا کہ اُسے فلاں مرض ہے اور وہ علاج سے مایوس بھی ہو گیا ہے اور یہ بھی دریافت کر لیا کہ ہومیوپیتھک میں اس کی دوا یہ ہے اور اتنے نمبر کی ہے۔ حالانکہ وہ ہومیوپیتھک ڈاکٹر بھی نہیں تھے۔

ساتھ ہی تصرف کی یہ قوت بھی ملاحظہ فرمایئے کہ وہ اپنے مرید کے پاس خواب میں تشریف بھی لائے اور ہدایت کر گئے کہ سلمان بابو سے فلاں دوا فلاں نمبر کی حاصل کر لو۔

دنیا سے اگر انصاف رخصت نہیں ہو گیا ہے تو اہل انصاف اس کا ضرور فیصلہ کریں گے کہ جب اپنے وفات یافتہ بزرگوں کے بارے میں اہل دیوبند کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ زندہ ہیں، صاحب اختیار ہیں اور ہر طرح کے تصرف کی قدرت رکھتے ہیں تو انبیا و اولیا کے بارے میں اسی عقیدے کے سوال پر سو برس سے وہ ہمارے ساتھ کیوں برسرِ پیکار ہیں؟ کیوں ان کا پریس زہر اُگلتا ہے؟ کیوں ان کے خطیب ہم پر آگ برساتے ہیں؟ کیوں ہمیں وہ گور پرست، قبر پجو اور شرک کے القاب سے مطعون کرتے ہیں؟ مجھے یقین ہے آج نہیں تو کل اُن کے نمائشی اسلام اور مصنوعی توحید پرستی کا طلسم ٹوٹ کر رہے گا۔ باخبر دنیا کو زیادہ دنوں تک وہ وسوسے میں مبتلا نہیں رکھ سکتے۔

---★★★---

ضمیر کا فیصلہ

کتاب کے خاتمے پر اب میں آپ کے ضمیر کا ایک کھلا ہوا فیصلہ چاہتا ہوں جو کسی خارجی جذبے کے زیر اثر ہونے کے بجائے صرف انصاف وحقیقت پر مبنی ہو۔

پچھلے اوراق میں علمائے دیوبند کے بزرگوں کے جو واقعات وحالات آپ نے پڑھے ہیں، چوں کہ اس کے راوی بھی خود علمائے دیوبند ہی ہیں، اس لیے اب یہ الزام ناقابلِ تردید ہوگیا ہے کہ جن اعتقادات کو یہ حضرات انبیا واولیا کے حق میں شرک قرار دیتے ہیں انہی کو اپنے گھر کے بزرگوں کے حق میں کیوں کر جائز ٹھہرا لیا ہے؟

اور وہ بھی کسی ایک آدھ کے بارے میں اس طرح کی روایت ہمیں ملتی تو ہم اسے سوءِ اتفاق یا لغزشِ قلم پر محمول کر لیتے لیکن حضرت شاہ امداد اللہ صاحب سے لے کر مولوی سید احمد رائے بریلوی، شاہ اسمٰعیل دہلوی، شاہ عبدالقادر دہلوی، مولوی محمد یعقوب صاحب نانوتوی، مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی، مولوی محمود الحسن صاحب دیوبندی، مولوی اشرف علی صاحب تھانوی اور مولوی حسین احمد صاحب مدنی تک، اتنے سارے دیوبندی اکابر کے متعلق ایک ہی طرح کے واقعات کا تسلسل کیا ہمیں یہ سوچنے پر مجبور نہیں کرتا کہ جس طرح انبیا کے حق میں انکار ونفی کے سوال پر سب متفق تھے بالکل اسی طرح گھر کے بزرگوں کے حق میں اقرار واثبات کے سوال پر بھی سب متحد ہیں۔ نہ وہاں قلم کا کوئی نسیان تھا نہ یہاں قلم سے کوئی سہو واقع ہوا ہے۔

اب یہ الگ سوال ہے کہ ایک ہی طرح کے معتقدات کو انبیا کے حق میں اُنھوں نے شرک قرار دیا اور ان سے نفی کی اور انھیں کو اپنے گھر کے بزرگوں کے حق میں جائز ٹھہرایا اور ان کا اثبات کیا۔

اگر واقعی وہ صفات وکمالات خدا کے ساتھ مخصوص نہیں تھے اور کسی مخلوق میں انھیں تسلیم

کرنا موجب شرک نہیں تھا تو پھر انبیا واولیا کے حق میں شرک کا حکم کیوں صادر کیا؟

اور اگر وہ صفات وکمالات خدا کے ساتھ مخصوص تھے اور کسی مخلوق میں انھیں تسلیم کرنا قطعاً موجب شرک تھا تو اپنے گھر کے بزرگوں کے حق میں کیوں اُنھیں جائز ٹھہرایا گیا؟

ان سب سوالوں کے جوابات کے لیے میں آپ سے آپ ہی کے ضمیر کا فیصلہ چاہتا ہوں۔

اس کے علاوہ بھی اگر کوئی جواب ہوسکتا ہے تو بتایئے کہ جسے اپنا سمجھا گیا اس کے فضل وکمال کے اعتراف کے لیے نہیں بھی کوئی جگہ تھی تو بنا لی گئی اور جو اپنے تئیں بے گانہ تھا اس کے قرار واقعی مجد وشرف کے اظہار میں بھی دل کا تُخل چھپایا نہ جاسکا۔

کتاب کی آخری سطر لکھتے ہوئے میں خوشی محسوس کرتا ہوں کہ میں اپنے علم واطلاع اور ایمان وعقیدے کے اخلاقی فرض سے آج سبکدوش ہوگیا۔

میں نے شواہد ودلائل کے ساتھ اپنا استغاثہ آپ کی عدالت میں پیش کر دیا ہے۔ فیصلہ دیتے وقت اس بات کا لحاظ رکھیے گا کہ قبر سے لے کر حشر تک کسی عدالت میں بھی آپ کا فیصلہ ٹوٹنے نہ پائے۔

وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَحِزْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ

ارشد القادری

مکتبہ جامِ نور، جمشید پور۔ یکم ربیع الاول ۱۳۹۲ھ

جدید کتابت۔
زیرِ اہتمام:۔ مسلم یونٹی فاؤنڈیشن، بھیونڈی، ضلع تھانہ، مہاراشٹر



